دل پھولوں کی بستی

PDFBOOKSFREE.PK

نگہت عبداللہ

"صبا۔" آسیہ کی پکار پر وہ نہ صرف چونکی بلکہ فوراً ٹیلی فون کے پاس سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ البتہ جواب نہیں دے سکی۔

"اٹھ گئیں بیٹا' ناشتا کر لیا؟" آسیہ نے لابی میں آ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا بات ہے، وہاں کیوں کھڑی ہو۔" آسیہ نے اس سے کہتے ہوئے ٹیلی فون کو دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔

"وہ مما' میں صفائی کر رہی تھی۔ نبیل بھائی کا کمرہ اتنا گندہ ہو رہا تھا۔"

"اچھا میرے پاس آؤ۔" آسیہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"یا اللہ۔" اس نے ٹیلی فون کو خائف نظروں سے دیکھا پھر آسیہ کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھنے لگی۔

"شکیل ماموں چلے گئے؟"

"ہاں' ابھی گئے ہیں۔ تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں بلایا نہیں۔ چلو پھر آئیں گے تو مل لینا۔" آسیہ نے سرسری انداز میں کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"ابھی تک مدحو کا فون نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار ہے۔"

"وہ مدحو کو کیوں لے گئے مما؟" اس نے پوچھا تو آسیہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر تاسف بھری ذرا سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"تمہارے دھوکے میں۔ وہ یہی سمجھے کہ دلہن وہی ہے اور یقیناً شادی پور پہنچنے تک وہ خود کو فاتح سمجھتے رہے ہوں گے، ہونہہ۔"

"مدحو دلہن۔" اس کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا۔

"تم پریشان نہیں ہو بیٹا، مدحو آ جائے گی۔" آسیہ اپنی سمجھ کے مطابق اسے تسلی دینے لگی۔ "میں اپنی غلطی کی سزا تمہیں اور مدحو کو نہیں بھگتنے دوں گی۔"

"آپ کی کیا غلطی ہے مما؟" اس نے گم صم سے انداز میں پوچھا۔

"میری ہی غلطی ہے بیٹا کہ میں نے عارفہ بیگم کے سارے جھوٹوں کا اعتبار کر لیا تھا اور ان کے کہنے کے مطابق جلد تمہاری شادی پر آمادہ بھی ہو گئی۔ انہوں نے جلدی کی ہی اس لیے تھی کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔ خیر ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ان کی جیت کا نشہ تو ہرن ہو ہی گیا ہو گا مزید۔"

آسیہ اپنے خیال میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی پھر قدرے توقف سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

"مجھے اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی طے کرتے ہوئے میں نے تم سے پوچھا تک نہیں تھا۔ پتا نہیں تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ مجھے کم از کم تمہیں اتنا حق تو دینا چاہیے تھا کہ تم اپنی سوچوں کا اظہار کر سکو۔ بالا ہی بالا فیصلہ کر لیا، جیسے مدیحہ کے وقت میں کیا تھا۔ شاید اس کی سزا ملی ہے مجھے۔ ادھر نے وہاں شادی کر لی اور تمہارے ساتھ یہ سب ہوا۔"

"نہیں مما۔" "آپ ایسا نہیں سوچیں۔" اس نے آسیہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ "آپ کے فیصلے غلط نہیں تھے۔ بس میری اور مدحو کی قسمت۔"

"قسمت خراب نہیں ہوتی بیٹا۔" آسیہ کے لہجے میں بے پناہ آزردگی سمٹ آئی تھی اور جانے کس خیال سے آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس مقام پر شاید وہ ٹوٹ رہی تھی۔

"مما، آپ رو رہی ہیں؟" وہ تڑپ کر اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں بیٹا، میں رو نہیں رہی۔" آسیہ نے بمشکل خود پر قابو پا کر اسے خود سے الگ کیا پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"بہت زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔ تم مدحو جیسی کیوں نہیں ہو؟ جیسے وہ ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اتنا ضبط کرتی ہو؟"

وہ حیران اور پریشان بھی ہو گئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں مما آپ۔ مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔" وہ آہستگی سے آسیہ کے ہاتھ ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہمیشہ سے آپ کو یہ شکایت رہی کہ مدحو جو میرے جیسی کیوں نہیں ہے اور اب۔"

"ہاں اب احساس ہو رہا ہے کہ وہی ٹھیک ہے۔ وہ نہ ملے تو چھیننا جانتی ہے اور چھن جائے تو بزدلوں کی طرح چپ کر آنسو نہیں بہاتی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور جانے لگی کہ آسیہ روک کر بولی۔

"سنو بیٹا' میں اصل بات کہنا تو بھول گئی۔"

"جی۔" وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

"وہ کسی بھی طرح سہی علی جہانگیر کے ساتھ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے تم کیا چاہتی ہو' یہ رشتہ قائم رہے یا؟" آسیہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں کچھ نہیں چاہتی مما' جو آپ کا دل چاہے کریں۔" وہ جلدی سے کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی غرض سے بی بی جان کے کمرے میں آئی تھی۔ لیکن آگے مہر النساء کو بی بی جان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر واپس جانے کیا سوجھی جو اس پر جتا کر پوچھنے لگی۔

"بی بی جان' میرے پاپا کہاں ہیں؟"

مہر النساء بری طرح تلملا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"آپ کو پتا ہو گا آنٹی، پاپا کہاں ہیں؟"

مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا' اسی طرح تلملاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

"انہیں کیا ہوا؟" اس نے بہت معصوم بن کر بی بی جان کو دیکھا پھر ان کے قریب بیٹھتی ہوئی ہنوز معصومیت سے بولی۔

"میرا خیال ہے آنٹی مہر النساء کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا لیکن میں خود سے تو نہیں آئی۔ لائی گئی ہوں' وہ بھی کڈنیپ کر کے۔"

"کیا کر کے؟" بی بی جان سمجھی نہیں۔

"کڈنیپ، خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں آپ تو میرے آنے سے خوش ہیں نا؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" بی بی جان نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

"خوش' بہت خوش ہے نا۔" اس نے کھلکھلا کر بی بی جان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور انہیں دائیں بائیں جھلاتی ہوئی بولی۔

"میں بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اماں جی سے بھی زیادہ۔ اماں جی کو جانتی ہیں' مما کی مما۔"

"نانی کو کہہ رہی ہو۔"

"جی نانی' انہیں ہم سب اماں جی کہتے ہیں۔ جیسے آپ سب کی بی بی جان ہیں۔" وہ ان سے الگ ہوتی ہوئی بولی۔

"تو میں تمہاری اماں جی سے زیادہ اچھی ہوں۔" بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔

"جی' لیکن بابا جان' ابا جی سے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔" اس نے فوراً حساب برابر کر دیا پھر ایک دم خیال آنے پر پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔

"اوہو، میں آپ سے پاپا کا پوچھنے آئی تھی۔ کہاں ہیں پاپا، میں نے صبح سے انہیں نہیں دیکھا؟"

"اسلام آباد گیا ہے۔" بی بی جان نے اسی قدر کہا تھا کہ اسے یاد آ گیا۔

"اچھا ہاں۔ رات بتایا تھا انہوں نے کہ صبح چھ بجے ان کی فلائٹ ہے اور یہاں سے تو وہ دو تین بجے ہی نکل گئے ہوں گے۔"

"کون؟" علی جہانگیر نے آتے ہوئے اس کا آخری جملہ سن کر کہا۔

"پاپا۔"

"وہ اسلام آباد گئے ہیں۔" علی جہانگیر نے کچھ بے دھیانی میں کہا تو وہ جتا کر بولی۔

"جناب مجھے معلوم ہے کہ اور یہ بھی کہ وہ کب آئیں گے۔"

"اچھا۔" وہ ذرا سا جھک کر بی بی جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے اجازت دیجئے بی بی جان۔"

"جا رہے ہو؟"

"جی۔" وہ بی بی جان کے گھٹنے چھو کر سیدھا ہوا تو وہ پوچھنے لگی۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کراچی' چلیں گی؟" اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"نہیں' ابھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی۔"

"بہت فرق ہے آپ میں اور صبا میں۔" علی جہانگیر اس روز سے مسلسل ہر بات میں دونوں کا موازنہ کر رہا تھا اور اس وقت کہے بغیر رہ نہیں سکا۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ آپ صبا سے۔" وہ اچانک کچھ یاد آنے پر ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔

"اچھا ہاں' اس روز بابا جان کہہ رہے تھے کہ انہوں نے صبا کو پہلی بار آپ کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے۔ آپ دونوں۔ اوہ مائی گاڈ کتنی کمینی ہے صبا' مجھے بتایا تک نہیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" علی جہانگیر نے یوں ہی کہہ دیا۔

"پھر آپ نے اتنے یقین سے کیسے کہا کہ ہم دونوں میں بہت فرق ہے۔" وہ جانے بی بی جان کی موجودگی فراموش کر گئی تھی یا قصداً نظر انداز کر رہی تھی جبکہ علی جہانگیر کو ان ہی کا خیال تھا جب ہی ٹالتے ہوئے بولا۔

"بتاؤں گا کبھی۔" پھر فوراً بی بی جان کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

"ایک منٹ' بی بی جان میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی علی رکیں۔

"کیا بات ہے؟" وہ جیسے بادل نخواستہ رکا تھا۔

"وہ آپ کراچی جا رہے ہیں ناں تو صبا سے بھی ملیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے فوراً نہیں کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"کیوں؟"

"اس کا جواب نہیں دے سکتا اور آپ میرے ذریعے اس سے کیا کہلوانا چاہتی ہیں۔ جو بھی کہنا ہے، خود کہیں۔ ٹیلی فون موجود ہے۔" علی جہانگیر کو اب تک یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ گھر فون کیوں نہیں کرتی؟

"فون تو میں کر لوں گی لیکن جو چیزیں میں اس سے منگوانا چاہتی ہوں۔ وہ فون کے ذریعے سے تو نہیں آ سکتیں۔ خیر چھوڑیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" وہ یکدم بے نیازی سی بن گئی۔

"خدا حافظ۔" وہ اندر ہی اندر جز بز ہوتا باہر نکل گیا۔

"ٹیلی فون موجود ہے۔" وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگی۔ "آخر سب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں گھر فون کروں۔ شاید جاننا چاہتے ہیں کہ مما پر کیا بیت رہی ہوگی ہونہہ۔ کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا مما کو۔ میں پہلے گون سا ان کے پاس رہتی تھی۔ البتہ صبا ضرور پریشان ہوگی اور وہ بھی اس خیال سے کہ کہیں میں نے اس کی چیز پر قبضہ تو نہیں کر لیا۔"

"کر بھی سکتی ہوں۔" اس نے اپنے آپ شاکی ہو کر سوچا تھا کہ رابعہ اس کے پاس آ کر بولی۔

"سنو تمہیں بابا جان بلا رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ تم ان ہی سے پوچھنا۔ ویسے بابا جان کے بلانے پر یہاں کیوں کا سوال کوئی نہیں اٹھاتا، بس فوراً چل پڑتا ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کہیں تم ان سے نہ پوچھ لو۔" رابعہ نے بڑے مخلصانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

وہ کندھے اچکا کر چل پڑی اور اس بار بابا جان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام' آؤ بیٹھو۔" بابا جان نے اپنے برابر اشارا کیا۔

"شکریہ۔" وہ آرام سے بیٹھ گئی۔

"خوش ہو' یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔" بابا جان پتا نہیں اچھے موڈ میں تھے یا اس سے بات کرنے کے لیے انہیں یہ لہجہ اوڑھنا پڑ رہا تھا۔

"نہیں' کوئی تکلیف نہیں ہے۔" اس نے سیدھا سادا جواب دیا۔

"اور اپنی ماں کو فون کیا تم نے۔" بابا جان نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں۔ وہ پریشان نہیں ہوگی تمہارے لیے۔"

"ہونا تو نہیں چاہیے کیونکہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ویسے آپ کو ان کی پریشانی سے۔"

بابا جان ایکدم کھانسنے لگے۔

وہ کچھ کر نظر انداز کرتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جب ان کی کھانسی رک گئی تب انہیں دیکھ کر بولی۔

"معاف کیجئے گا بابا جان! آپ بہت بزدل ہیں۔"

"ہاہاہا۔" بابا جان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں مذاق نہیں کر رہی' سچ کہہ رہی ہوں۔ مما سے بیٹی لینے کے لیے آپ نے طویل انتظار کیا۔ اس کے بعد بھی براہ راست ان سے بات نہیں کر سکے۔ کیوں یہ خدشہ تھا نا کہ مما انکار کر دیں گی۔ تو وہ تو انہیں کرنا ہی تھا' اس کے بعد اصل جنگ لڑنی تھی آپ کو۔" وہ انہیں بزدل ثابت کرنے کے لیے بڑی جرات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

بابا جان کی آنکھوں میں تبسم سمٹ آیا تھا۔

"اب تو آپ کبھی نہیں جیت سکتے کیونکہ آپ نے مما کے ساتھ فاؤل کھیلا ہے۔ ویسے مجھے یہ گیم بڑا دلچسپ لگ رہا ہے اور میری دعائیں اپنے باپ' دادا کے ساتھ ہیں۔" آخر میں وہ بڑے محظوظ انداز میں مسکرائی تھی۔

"تم نے ابھی اپنے باپ' دادا کو صرف دیکھا ہے' جانا نہیں۔ ہم ہارنا نہیں جانتے۔ آسیہ سے بیٹی چھین لانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن ہم تمہارے باپ سے کیے وعدے سے مجبور تھے۔ جو نہیں چاہتا تھا کہ آسیہ سے بیٹی چھینی جائے اور ہمیں آسیہ کے سامنے دامن پھیلانا گوارا نہیں تھا۔" بابا جان بڑے غصے سے چبا چبا کر بول رہے تھے۔

"پاپا، پاپا کیوں نہیں چاہتے تھے۔" وہ اسی ایک بات میں اٹک گئی تھی۔

"احمق ہے وہ۔" بابا جان نے شاہ سکندر کی حماقت سوچ کر سر جھٹکا۔ اسے بتانا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔

"مما بھی احمق ہیں' پاپا بھی احمق۔" اسے سیما بھابھی کا آسیہ کو احمق کہنا یاد آ گیا تھا۔ جب ہی زیر لب بڑبڑاتی پھر ایکدم چونک کر پوچھنے لگی۔

"آپ نے بتایا نہیں' پاپا نے کیا حماقت کی؟"

"کوئی ایک حماقت؟" بابا جان کو فوراً احساس ہو گیا۔ "نہیں تم بچی ہو۔ اپنے باپ کے بارے میں تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ چلو جاؤ۔"

"آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا؟" وہ بھی شاید اصل کام بھول گئے ہیں۔

"تمہارا حال احوال پوچھنے کے لیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا اور ہاں آغا سے کہو تمہیں قصبے کی سیر کرا لائے اور اپنے باپ کا فارم بھی دیکھو جا کر۔"

"آغا لے جائے گا، ہونہہ۔" وہ آغا کا رویہ سوچ کر نخوت سے سر جھٹکتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

❁ ❁ ❁

بڑے بے کیف سے دن تھے۔ زندگی میں جیسے کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا' سوائے انتظار کے۔

مدیحہ کے فون کا انتظار۔

آسیہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے!

اور اس انتظار کے اختتام پر کیونکہ اسے کسی اچھی بات کی امید نہیں تھی اس لیے اس کی طوالت غنیمت لگ رہی تھی۔ البتہ خدشات چین نہیں لینے دیتے تھے۔ مدیحہ کا خیال آتا تو وہ گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی کہ جانے شاہ پور والے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟ شاید اسے کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا۔ جب ہی تو اس نے فون نہیں کیا۔ ورنہ وہ پہلی فرصت میں اسے فون کرتی اور ایک ایک کے بارے میں بتاتی' خصوصاً شاہ سکندر کے بارے میں اور یہ ضرور کہتی کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس کا یہی جملہ سننے کو بڑی بے چین تھی اور کتنی دیر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی۔

دن میں کتنی بار اسے علی جہانگیر کا خیال بھی آتا تھا۔ لیکن یوں کہ اس کے وجود میں نفرت اور تنفر کی آگ سی ایک اٹھتی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اس کے خیال کو فوراً جھٹک بھی نہیں پاتی تھی۔ اسی کی طرح اس کا خیال بھی بڑا زور آور تھا۔ وہ لاکھ خود کو ادھر ادھر مصروف رکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی گرفت سے نہیں نکل پاتی تھی۔ آخر اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔

"میں نے کبھی کسی کا برا چاہا نہ سوچا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" کبھی آسیہ بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ اب اس کی سوچیں اس بات پر اٹک جاتی تھیں۔

❁ ❁ ❁

اس وقت وہ ٹیرس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اپنے دکھ میں وہ تھی بھی تنہا۔ کیونکہ کسی کو ہمراز بنایا تھا نہ ہم نوا۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک المیے کو جانتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ محبت کی رہ گزر پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگرچہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اسے اپنے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے آنا تھا۔

"صبا!" نبیل نے دوسری بار پکارا۔ اس نے چونک کر دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی نہیں ہوئی۔

"اتنا مت سوچا کرو۔" نبیل اس کے قریب چیئر کھینچتے ہوئے بولے۔ "سوچنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے اور تم نے تو سب کچھ سوچ پر چھوڑ دیا ہے پھر تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"مدوا میں مدو کے لیے پریشان ہوں۔" وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔

"صرف مدو کے لیے؟" نبیل کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ اس کا دل پوری قوت سے پھیل کر سمٹا تھا۔

"سنو! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن جانتا ضرور ہوں۔ اس بات سے تم انکار نہیں کر سکتیں کہ بہت ساری باتیں تمہارے کہے بنا جان لیتا ہوں۔"

اس نے بہت خائف ہو کر سر جھکا لیا کہ جانے وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔

"اور تمہاری زندگی کے نئے باب کو میں نے اس وقت جان لیا تھا جب تم نے اس کا عنوان تجویز کیا تھا۔ بہت رازداری برتی تم نے صبا! اب مت چھپاؤ۔ میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں' دوست بھی ہوں۔ کیا ہر مسئلے کو ہم نے دوستوں کی طرح شیئر نہیں کیا۔" نبیل نے بہت دھیرج سے اس کے راز میں شریک ہونے کا دعویٰ کر کے ٹوکا تھا۔

اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ کر نبیل ایکدم خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف سے اپنے آپ کہنے لگے۔

"میں علی جہانگیر سے چند بار ہی ملا ہوں' اس لیے زیادہ اسے نہیں جانتا اور جتنا جانا' اس کے بارے میں

بھی اب یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا پھر بھی میں تمہیں بتاؤں کہ پہلی ملاقات میں وہ مجھے بہت سچا اور کھرا انسان لگا تھا۔ اس کے بعد جب رشتے کی بات چلی تب میں نے محسوس کیا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے جبکہ اس کی ماں کے ہر انداز میں مجھے بناوٹ نظر آتی تھی۔ جسے میں نے یوں اہمیت نہیں دی کہ ایک تو علی جہانگیر ہر لحاظ سے بہت مضبوط لگ رہا تھا، یعنی ہر مخالفت کو زیر کرنے والا۔ دوسرے تم' تمہاری محبت مجھے یقین تھا کہ تمہاری سادگی اور محبت بہت جلد عارفہ بیگم کو تمہارا گرویدہ بنا دے گی اور علی جہانگیر تو پہلے ہی۔" وہ خاموش ہو کر جیسے اپنی ہی بات سوچنے لگے تھے۔

وہ ابھی بھی اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن پوری جان سے ان کی طرف متوجہ تھی۔

"پتا نہیں میں نے علی جہانگیر کو سمجھنے میں غلطی کی یا تم بتاؤ' تمہیں کیا لگتا ہے؟ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر اچانک اس سے پوچھا۔

وہ کچھ بول سکی نہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی۔

"خاموش مت رہو صبا! مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ اگر علی جہانگیر تمہارے ساتھ ایماندار ہوا' تب بھی تم اسے صرف اس لیے ٹھکرا دو گی کہ وہ شاہ جہانگیر کا بیٹا ہے؟ نہیں' ایسا مت کرنا۔ یہ اس کے ساتھ ہی نہیں، خود تمہارے ساتھ بھی ظلم ہوگا کیونکہ تم کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتیں۔"

"کرتی ہوں' علی جہانگیر سے شدید نفرت کرتی ہوں۔" وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"بے وقوف!" نبیل کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی اور بڑے سکون سے اس کے چپ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

کتنی دیر بعد وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی تو نبیل جیب سے رومال نکال کر اسے تھماتے ہوئے بولے۔

"خود کو دھوکا مت دو۔ تم صرف پھوپھو کا خیال کر رہی ہو۔"

"ہاں' مجھے مما کا خیال ہے۔ مما کے لیے میں جان بھی دے دوں گی۔ علی جہانگیر کی محبت اور ایمانداری سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں وہی کروں گی جو مما کہیں گی۔" وہ رومال سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرتے ہوئے جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی۔

"تو پھر روتی کیوں ہو؟"

"مجھے اپنے آپ پر رونا آتا ہے۔ کیوں دھوکے میں آ گئی میں۔"

"اچھا جاؤ' پہلے منہ دھو کر آؤ اور بوا سے چائے کا بھی کہتی آنا۔ نبیل کو اس کے بے تحاشا بہتے آنسوؤں سے دکھ ہو رہا تھا۔ جب ہی اسے اٹھا دیا۔

❁ ❁ ❁

"اف نبیل بھائی سب جانتے ہیں۔" اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچا دوبارہ ان کے پاس جانے کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔

"کیا کروں؟" بوا سے چائے کا کہہ کر وہ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ فون کی بیل پر نبیل وہیں سے پکار کر بولے۔

"صبا! دیکھو کس کا فون ہے؟"

اس نے آ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"کیسی ہو صبا اور مما کیسی ہیں؟" دوسری طرف مدیحہ تھی۔

"مدحو' مدحو! تم ٹھیک تو ہو۔" وہ ایک دم بے اختیار ہو گئی۔

"بالکل ٹھیک' فرسٹ کلاس اور بہت خوش۔" مدیحہ کھنکتی ہوئی آواز میں شروع ہو گئی تھی۔

"میں بتا نہیں سکتی صبا! کہ مجھے یہاں آ کر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ یہ تو سچ مچ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ کوئی غم' کوئی فکر نہیں اور وہ علی جہانگیر کتنا ہینڈسم' کتنا اسمارٹ اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ اس پوری حویلی میں سب میں نمایاں نظر آتا ہے۔"

وہ مدیحہ کی آواز سن کر جتنی خوش ہوئی تھی' اب اتنی ہی گم صم اور دل تھا کہ اندر کسی اتھاہ میں ڈوبا جا رہا تھا۔

معاً نبیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا۔

اس نے وحشت زدہ آنکھوں سے نبیل کو دیکھا تو وہ اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر اپنی کان سے لگا کر بولے۔

"ہیلو' کون؟"

"میں ہوں مدحو۔ وہ صبا کہاں گئی۔" ادھر سے مدیحہ نے ہنوز اسی انداز میں پوچھا۔

"کیسی ہو مدحو' کہاں ہو؟" نبیل اس کا سوال نظر انداز کر گئے۔

"شاہ پور' اپنے باپ کے پاس۔ آپ نے تو میری بات نہیں مانی تھی نبیل بھائی پھر بھی دیکھ لیں' میں پہنچ گئی ہوں۔" مدیحہ نے کھلکھلا کر کہا۔

"ہاں' تمہاری آرزو پوری ہو گئی۔ کسی بھی طرح سہی۔" نبیل نے بادل نخواستہ کہا تھا' جبکہ نظریں صباحت پر جمی تھیں۔ جس کی آنکھیں روانی سے بھیگ رہی تھیں۔

"آپ کو افسوس ہو رہا ہے؟" ادھر سے مدیحہ نے ٹوکا۔

"ہاں تمہاری آرزو پوری ہونے پر نہیں بلکہ غلط طریقے سے پوری ہونے پر افسوس ہے۔" انہوں نے تاسف سے کہا۔

"صحیح طریقے کے لیے تو میں سر پٹخ کر رہ گئی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ اس لیے مجھے کوئی افسوس نہیں۔ خیر چھوڑیں' یہ بتائیں مما کہاں ہیں؟"

"کیا مطلب' اتنے سے دنوں میں تم یہ بھی بھول گئیں کہ پھوپھو اس وقت کہاں ہوتی ہیں۔" نبیل کے جتانے پر وہ بجائے شرمندہ ہونے کے حیرت سے بولی۔

"کلینک واقعی مما کلینک گئی ہیں؟"

"تم کب آ رہی ہو؟" نبیل اس کی حیرت اور سوال نظر انداز کر گئے۔

"کبھی نہیں۔" مدیحہ نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو نبیل ریسیور رکھ کر صباحت سے بولے۔

"تم اس کے لیے رو رہی ہو' جسے کسی بات کی پروا نہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اور شدت سے رونے لگی۔

"میرے خدا! مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ پھوپھو نے تم دونوں کی خاطر خود پر زندگی کے دروازے بند کر لیے۔ کاش وہ اپنے لیے سوچتیں۔"

نبیل کو جانے اس کے رونے پر غصہ آیا تھا یا مدیحہ پر۔ گو کہ بہت ضبط کے بعد بولے تھے پھر بھی ان کا لہجہ سخت تھا۔

"بند کرو رونا' ورنہ میں تمہیں بھی اسی وقت شاہ پور چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں۔" وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

⊛ ...... ⊛ ...... ⊛

علی جہانگیر نے اپنے لیے اس خسارے کو منتخب کیا تھا جس کی تلافی ممکن ہو سکتی تھی۔ یعنی اس نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد وہ صباحت کو یقین دلائے گا کہ ان سارے جھگڑوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ کسی سازش میں شریک رہا ہے۔ بلکہ اس نے تو اس وقت صباحت کو پسند کر کے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اسے یقین تھا کہ فوراً نہیں تو دھیرے دھیرے وہ اس کا اپنی محبت پر اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن یہاں تو سارا معاملہ ہی خراب ہو گیا تھا۔ یعنی حالات عجیب صورت اختیار کر گئے تھے اور بابا جان کی حکمت عملی تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں مدیحہ کہاں تھی' جو اس کی ماں اور بہن کو بھی نظر نہیں آئی۔ البتہ صباحت کے منہ سے اس نے ایک آدھ بار بہن کا ذکر سنا تھا۔ وہ بھی اس نے خصوصی طور پر نہیں بتایا تھا۔ ایک بار تو اس کے فون کرنے پر ادھر سے مدیحہ نے ترخ کر کہا تھا کہ میں صباحت نہیں ہوں اور دوسری بار بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا جو اسے اب سوچنے پر یاد آ رہا تھا اور یہ بھی کہ خود اس نے مدیحہ کے ذکر کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی' ورنہ اگر وہ دلچسپی ظاہر کر کے پوچھتا تو یقیناً صباحت اس کے بارے میں بتاتی۔

بہرحال اب تو اس نے خود ہی دیکھ لیا تھا بلکہ جان بھی گیا تھا کہ وہ صرف ظاہراً صباحت سے مشابہ ہے اور اس پر اسے افسوس ہی نہیں' دکھ بھی تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ جب ہی وہ مایوس ہو کر واپس کراچی آ گیا تھا اور چھٹی منسوخ کرا کے آفس بھی جوائن کر لیا تھا' ورنہ اگر مدیحہ اس کی فون پر ہی صباحت سے بات کرانے کی ہامی بھر لیتی تو اتنی جلدی وہ کبھی نہ آتا۔ گویا دونوں بہنوں نے ہی اسے مایوس کیا تھا اور مدیحہ کی تو اسے زیادہ پروا نہیں تھی۔ البتہ صباحت کی طرف سے بہت فکر مند تھا کہ وہ لڑکی جانے اس کے بارے میں کیا سوچتی ہو گی اور کتنا روتی ہو گی۔ اس کے آنسوؤں پر بند باندھنے کے لیے ہی وہ دن میں کتنی بار اس کے نمبر ڈائل کرتا تھا۔ خصوصاً ان اوقات میں جب اسے یقین ہوتا کہ وہ اکیلی ہو گی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ادھر وہ اس کی آواز سنتے ہی فون رکھ دیتی تھی۔ جس پر وقتی طور پر جھنجلاتا' غصہ بھی آتا پھر اسے حق بجانب سمجھتے ہوئے نئے سرے سے اس تک رسائی حاصل کرنے کی تدبیر سوچنے لگتا۔

اس وقت اچانک اسے نبیل کا خیال آیا تھا اور یہ سوچ کر کہ وہ کم از کم فون تو بند نہیں کریں گے۔ اس نے وقت دیکھ کر ان کی موجودگی کا یقین کر کے نمبر ڈائل کیے تھے۔

تیسری بیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ کسی خاتون (یوا) کی آواز اٹھی۔ اس نے فوراً نبیل کو بلانے کا کہہ دیا تاکہ اس کی بابت کوئی سوال نہ ہو۔

"ہیلو السلام علیکم۔" نبیل کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل کر بولا۔

"جی میں علی جہانگیر۔ کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟"

"میرا خیال ہے اخلاقی طور پہ میں اتنا دیوالیہ نہیں ہوا کہ نہیں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دوں۔" نبیل نے کہا تو

اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک۔ آپ سنائیں کیسے یاد کیا؟"

"معاف کیجیے گا نبیل صاحب! ہم ان رسمی باتوں سے آگے نکل آئے ہیں۔" اس نے جز بز ہو کر کہا تو ادھر سے نبیل بے ساختہ بولے تھے۔

"بہت آگے۔" ان کے لہجے میں طنز بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ نظر انداز کر گیا۔

"بہرحال میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"شکریہ۔ کل دن میں جو وقت آپ کو سوٹ کرے بلکہ میریٹ میں لنچ پر میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

"او کے' خدا حافظ۔" ادھر سے سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس نے گہری سانس کھینچی پھر ریسیور رکھ کر کل کا پروگرام سوچنے لگا تھا۔

اگلے دن اس نے آفس سے ہی میریٹ میں ٹیبل ریزرو کروالی تھی اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ بھی گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کوفت میں مبتلا کرنے والا انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ یعنی نبیل ٹھیک وقت پر آ گئے تھے۔

"شکریہ' آپ نے میری دعوت قبول کی۔" وہ بیٹھتے ہی بولا۔ پھر مینو پر نشان لگانے کے بعد پوری طرح نبیل کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں بلکہ میں بہت عجیب سا محسوس کروں گا اپنے دادا کے اس اقدام کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے۔ جس سے میری پوزیشن اتنی آکورڈ ہو گئی ہے کہ میری منکوحہ میری آواز تک سننے کی روادار نہیں رہی۔"

"اس کا ردعمل غلط اور ناجائز تو نہیں ہے۔" نبیل نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بالکل نہیں۔" وہ فوراً بولا تھا۔ "میں انہیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔"

"پھر تو آپ کو سکون سے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ اس کی ماما کے فیصلے کا۔ کیونکہ وہ ہر بات کا اختیار اپنی ماما کو سونپ کر خود الگ ہو گئی ہے۔"

نبیل نے کہا تو وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم ہونٹ بھینچ گیا۔ ساتھ ہی اس کی پیشانی پر لکیریں بھی نمودار ہو گئی تھیں' پھر سوچتے ہوئے انداز میں انہیں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیا آپ صباحت کو مجھ سے ملنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟"

"مشکل ہے۔"

"ناممکن تو نہیں۔ صرف ایک بار۔"

نبیل اس کی بے قراری اور آنکھوں سے چھلکتے جذبوں کی سچائیاں دیکھ کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر بولے۔

"وعدہ نہیں کر رہا۔ البتہ کوشش ضرور کروں گا۔"

"تھینک یو اینڈ پلیز۔" اس نے شکریے کے ساتھ انہیں کھانے کی طرف متوجہ کیا' پھر بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ صباحت کی کوئی بہن بھی ہے بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ جب مدیحہ نے بتایا تب بھی بابا جان تو یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔"

"اور آپ۔" نبیل ایک دم پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔ "آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔"

"فوراً۔"

"کیوں۔ میرا مطلب ہے بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے دونوں میں۔"

"میں صرف ظاہر نہیں دیکھتا۔" وہ بے اختیار کہہ کر فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گیا تو مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ نبیل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں۔

❁ ❁ ❁

وہ لاؤنج میں بیٹھی گود میں رکھی مونگ پھلی کھانے کے ساتھ گلاس وال سے الماس کو دیکھ رہی تھی۔ جو روش پر یوں ٹہل رہی تھی جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اور خود اسے شاہ سکندر کا انتظار تھا جن کی آج اسلام آباد سے آمد متوقع تھی۔ جب ہی الماس کے اس طرح ٹہلنے پر وہ یہی سمجھی کہ وہ اپنے انتظار کو اس پر جتا کر باپ کے ساتھ اس سے زیادہ اپنی وابستگی ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

اور وہ مدیحہ تھی۔ ایسے فطری مظاہروں کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ نانا ابا کے گھر میں اس کی کسی کے ساتھ بنتی ہی اس لیے نہیں تھی کہ صباحت کو اس کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور محبت حاصل تھی اور اس کی وجہ صباحت کا ہر ایک پر جان چھڑکنا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس اپنے آپ متنفر اور شاکی ہو جاتی تھی۔ ابھی بھی یہی حال تھا۔ الماس کے خلاف دل میں خواہ مخواہ ابال اٹھنے لگے تھے اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ مونگ پھلی کے دانے منہ میں ڈالتی اور چھلکے الماس کی طرف اچھال رہی تھی۔ جیسے اس کا نشانہ لے رہی ہو۔ حالانکہ درمیان میں گلاس وال تھی اور اس سے بھی کافی فاصلے پر الماس ٹہل رہی تھی۔

بڑے گیٹ سے جیپ اندر داخل ہوئی تو کچھ دیر کو اس کا دھیان الماس کی طرف سے ہٹ گیا لیکن جب جیپ الماس کے قریب رکی اور اس میں سے اتر کر شاہ تیمور نے جس انداز سے مسکرا کر اسے سلام کیا اس سے وہ اپنی جگہ اچھل پڑی۔

"اوگاڈ! تو یہ معاملہ ہے؟"

شاہ تیمور اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ فوراً انجان بن کر اپنی مونگ پھلی میں مصروف ہو گئی لیکن جیسے یہ شاہ تیمور اس کے قریب سے گزرنے لگا اس نے پکار لیا۔

"ایکسکیوزمی گرلز۔"

"جی مجھ سے کچھ کہا۔" شاہ تیمور نے رک کر اسے دیکھا۔

"ہاں، وہ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ وہی ہیں نا جو مجھے میرج ہال سے اٹھا کر لائے تھے۔" اس نے بظاہر بڑی سادگی سے پوچھا۔

شاہ تیمور نے ہنس کر ایک طرح سے اعتراف کیا تو وہ ہتھیلی پر مونگ پھلی رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لیجیے مونگ پھلی کھائیے۔"

"شکریہ۔" شاہ تیمور اس کی ہتھیلی سے چند دانے اٹھا کر آگے بڑھ گیا تو اس کے غائب ہونے تک وہ اس

کے پیچھے دیکھتی رہی پھر کسی خیال سے کندھے اچکا کر گردن سیدھی کی تو الماس کو سر پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"مہراں۔" الماس نے اسے جواب دینے کے بجائے ملازمہ کو پکارا اور اس کے آنے پر ادھر ادھر بکھرے مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرف اشارا کر کے بولی۔ "صاف کرو یہ سب۔ پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں جاہل، جنگلی۔"

"آ نہیں جاتے، لائے جاتے ہیں۔" وہ خلاف عادت ایک دم آپے سے باہر ہونے کے بجائے آرام سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس سے اس کی گود میں رکھی مونگ پھلی کارپٹ پر پھیل گئی تھی اور وہ اس کی طرف اشارا کر کے الماس سے بولی۔

"یہ تم کھا لو تھوڑی آغا کو بھی دے دینا۔"

"ہونہہ۔" الماس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"ہونہہ!" وہ اس کی نقل اتار کر ہنستی ہوئی اوپر آ گئی۔

اس کا کمرہ شاہ سکندر کے اسٹڈی روم سے ملحق تھا اور وہ جب دل چاہتا درمیانی دروازہ کھول کر اسٹڈی میں چلی آتی تھی۔ حالانکہ اسے مطالعے کا شوق کبھی بھی نہیں تھا اور ابھی بھی وہ ایسے کسی خیال سے نہیں آئی تھی۔ نہ اس کے اندر کوئی تجسس تھا کہ اپنے باپ کا انتخاب ہی دیکھ لے۔ اس کی جگہ اگر صباحت ہوتی تو ایک ہی دن میں سب کھنگال چکی ہوتی لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ محض مہر النساء پر اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اس نے اس کمرے میں آنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ اصل میں اس کے یہاں آنے کے دوسرے دن مہر النساء ہی نے اپنے طور پر اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ شاہ سکندر کا خاص کمرہ ہے جس میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے اور اس کے کچھ دیر بعد ہی وہ شاہ سکندر کے پیچھے اس کمرے میں نہ صرف داخل ہو گئی بلکہ درمیانی دروازے کا لاک بھی ان سے کھلوا لیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جب بور ہو گی یا گھبرائے گی تو کتابوں میں اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرے گی اور شاہ سکندر ظاہر ہے منع نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پہلی بار آئی تھی ورنہ شاید پس و پیش ضرور کرتے۔ بہر حال اس وقت وہ اپنے کمرے میں دستک کے بغیر سیدھی اسٹڈی میں آ کر بیٹھی تو کچھ دیر الماس کے ساتھ ہونے والی معمولی سی جھڑپ پر اپنے آپ محظوظ ہوتی رہی پھر ایک دم اس کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ آپریشن، صباحت وہ سب سے شاکی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی بھی اس کے لیے پریشان نہیں تھا۔ اس کے برعکس اپنے معمولات میں یوں مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"تو مجھے کب کسی کی پروا ہے؟ بہت خوش ہوں میں یہاں آ کر۔ سب میرے اپنے ہیں۔" وہ جانے کس احساس میں گھر کر خود کو باور کرانے لگی تھی کہ اچانک ٹیوب لائٹ آن ہونے سے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ سکندر کو دیکھ کر قصداً مسکرائی۔

"آپ کب آئے؟"

"کچھ دیر ہوئی۔ نیچے بابا جان کے پاس تھا۔" شاہ سکندر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے قریب آ گئے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ ٹہلاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"آپ اداس تو نہیں ہو؟"

"نہیں، اداس کیوں ہوں گی؟"

"اپنی ماما اور سسٹر کے لیے فون کیا تھا؟"

"جی' مما سے بات نہیں ہوئی۔ صبا اور نبیل بھائی ٹھیک ہیں اور پوچھ رہے تھے کہ میں کب واپس آؤں گی۔"

اس نے سرسری انداز میں بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا تھا۔

"آپ نے کیا کہا؟"

"ابھی نہیں۔ مما پوچھیں گی تو انہیں بھی میں یہی جواب دوں گی۔"

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے آپ یہاں خوش ہو۔ ویری گڈ۔"

"میں تو خوش ہوں پاپا! لیکن صبا یہاں آ کر کبھی خوش نہیں ہوگی۔ اسے مما اور نبیل بھائی کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ وہ ان سے ہٹ کر کچھ سوچ سکتی ہے۔ ڈرتی بھی بہت ہے مما سے۔ اگر وہ یہاں آ جاتی ناں تو رو رو کر جان دے دیتی۔" وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

"شاید اس کے ذہن میں یہاں کا تصور خوفناک ہوگا۔" شاہ سکندر نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ ان سنی کر کے ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اس روز بابا جان کہہ رہے تھے کہ ان کے لیے مما سے بیٹی چھین لانا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ آپ سے کیے وعدے سے مجبور تھے کیونکہ آپ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟" اس نے ریک کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر شاہ سکندر کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"پھر تو بابا جان کے اس سارے پلان سے بھی آپ بے خبر رہے ہوں گے؟"

وہ ہنوز سرسری انداز لیے ہوئی تھی، لیکن اس بار شاہ سکندر کچھ ٹھٹک گئے اور جواب سے بچنے کی خاطر سامنے ٹیبل پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

"میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا! عمران سے کہو، چائے لے آئے اور دیکھنا میں موبائل کہاں چھوڑ آیا ہوں؟ شاید بیڈ روم میں ہوگا۔"

وہ انہیں دیکھتی ہوئی کمرے سے نکلی تو پہلے عمران کو پکار کر چائے کا کہا پھر ان کے بیڈ روم سے موبائل لے کر واپس آئی تو انہیں تھمانے کے بجائے خود ہی نمبر پش کرنے لگی۔

"مجھے دو۔" شاہ سکندر نے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔

"ہیلو۔"

"کون نبیل بھائی؟" وہ غیر محسوس طریقے سے شاہ سکندر کی طرف سے رخ موڑ کر بات کرنے لگی۔

"مما کو بلائیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔"

شاہ سکندر اس کی پشت پر نظریں جمائے پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ چیخ کر بولی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"کیوں کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟"

"ظاہر ہے۔ جہاں ہوں' وہیں سے بات کر رہی ہوں۔"

"یہ میں آپ کو نہیں' مما کو بتاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ انتظار کریں۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر پلٹ کر

موبائل شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"مما' شاہ پور والوں سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔"

شاہ سکندر کچھ نہیں بولے۔ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنا نمبر پش کرنے لگے تو وہ مزید کہنے کا ارادہ ترک کر کے اس کمرے سے نکل آئی تھی۔

"مجھ سے کس بات پہ ناراض ہو؟" نبیل نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بہت سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں ناراض نہیں ہوتی۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"تو پھر تمہاری اس خاموشی کو اور کیا نام دیا جائے؟ بولو۔" نبیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہلایا۔ "اور کچھ نہیں تو اپنی پریشانی تو بتاؤ۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔"

"پہلے کون کہتا تھا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟" نبیل فوراً اصل بات کی طرف آ گئے۔

"کس سلسلے میں؟" اس نے سر اونچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"شاہ علی جہانگیر کے بارے میں۔"

"نبیل بھائی پلیز میں یہ نام سننا نہیں چاہتی۔" وہ عاجزی سے ٹوک کر گویا ہوئی۔ "اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں مما پر چھوڑ چکی ہوں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے کیا سوچا ہے؟"

وہ تو تمہاری رخصتی کا سوچ رہی ہیں۔" نبیل نے اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے اپنی طرف سے کہہ دیا۔

"ہرگز نہیں۔ میں زہر کھا لوں گی اگر مما نے ایسا کچھ سوچا تو۔" وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

"ارے رے۔" نبیل نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں معلوم پھوپھو نے کیا سوچا ہے۔ البتہ تمہارا ارادہ معلوم ہو گیا ہے بہت خطرناک ہے۔ آخر ہو نا مدیحہ کی بہن۔"

"وہ صرف دھمکیاں دیتی ہے۔ میں عمل کروں گی۔"

"کم آن صبا! تمہارے منہ سے ایسی باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ بیٹا! اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے اور تم تو کبھی ایسی نہیں تھیں پھر اب تمہیں کیا ہوا ہے؟ اگر ہر بات پھوپھو پر چھوڑ چکی ہو تب تو تمہیں ہر دو صورتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" نبیل نے دھیرج سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

"میری ایک بات مانو گی؟" قدرے توقف سے نے پوچھا۔

وہ سر اونچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں چاہتا ہوں۔ تم ایک بار علی سے مل لو۔"

"کیوں' میں کیوں ملوں۔ اپنا پہچان کرانے کے لیے؟ اسے بتاؤں کہ میں صباحت ہوں اور وہ جو اس کے پاس ہے وہ۔۔۔ وہ مدیحہ ہے۔ نہیں' میں یہ نہیں کر سکتی۔ مدحو وہاں خوش ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اسے وہیں رہنے دیجیے۔" وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

نبیل اس کی باتوں میں الجھ گئے تھے۔ اس کے رونے پر بس چپ چاپ دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی اٹھنے لگی تھی کہ انہوں نے ایک دم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بے اختیار بولے تھے۔

"سنو! محبت کرنے والے اپنی محبت کو چہروں سے نہیں دل سے پہچانتے ہیں۔ کیا کبھی میں نے تم پہ مدیحہ کا گمان کیا ہے؟"

"آپ!" وہ تحیر سی پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"ہاں میں۔ مدیحہ سے محبت کرتا ہوں۔

اس کی تمام تر بدتمیزیوں اور ہٹ دھرمیوں کے باوجود۔

اس کے توہین آمیز تلخ رویوں کے باوجود۔

اور اپنے لیے اس کی نفرتیں جاننے کے باوجود میں نے صرف اسی سے محبت کی ہے۔

اور یہ محبت ہی ہے جو مدیحہ کے ساتھ اس جیسی ایک صرف تم ہی نہیں ہزاروں لاکھوں کھڑی ہو جائیں۔ تب بھی میں اپنی مدیحہ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کروں گا۔"

نبیل جیسے بے خودی میں بول رہے تھے۔ ان کے لہجے میں جذبوں کی سچائیاں تھیں۔ آنکھوں میں رنگ اترے تھے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور چہرہ اس وقت دل کا آئینہ بن گیا تھا۔ شفاف آئینہ جس پر مدیحہ کے تلخ رویوں کی لکیریں واضح نظر آ رہی تھیں۔

"نبیل بھائی!" اس نے اسی تحیر کے عالم میں آہستگی سے ان کا ہاتھ تھاما تو وہ ایک دم ہوش میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نبیل بھائی!" وہ ان کے ساتھ کھڑی ہو کر چیخ پڑی۔ "آپ مدحو سے محبت کرتے ہیں۔ اس پتھر سے جس پر کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ جذبوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں پھر آپ نے اپنے جذبے اس کے نام کیوں لکھ دیے؟ بہت رسوا کرے گی وہ آپ کو۔"

"دھیرج' دھیرج۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کر ذرا سا مسکرائے۔

"نہیں نبیل بھائی! میں' آپ کو رسوا نہیں ہونے دوں گی۔"

"تو اس راز کو اپنے اندر دفن کر دو۔" ان کے لہجے میں اچانک آزردگی سمٹ آئی تھی پھر ایک دم خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔ "تم نے مجھے کہاں الجھا دیا۔ اصل بات تو وہیں رہ گئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں' وہ علی جہانگیر۔ کیا تمہیں اس کی محبت پر بھروسا نہیں ہے؟"

"محبت ہوتی تب نا۔ وہ تو باقاعدہ ایک پلان کے تحت آیا تھا۔" وہ تاسف سے کہہ کر ان کی طرف سے رخ موڑ گئی۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ تو کیا اس کے بعد محبت نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں' اور اگر ہو تب بھی میں یقین نہیں کروں گی کیونکہ اس کی بنیاد میں جھوٹ اور فریب شامل ہے اور اگر اسے بھی نظر انداز کر دوں تو بھی میں مما کو دکھ نہیں دے سکتی۔ آپ نے دیکھا نہیں مدحو کے جانے سے مما کیسی ہو گئی ہیں۔ کمزور اور خاموش گو کہ ہم پر ظاہر نہیں کرتیں لیکن میں جانتی ہوں وہ اندر سے کتنی دکھی ہیں۔ کاش مدحو میں احساس نام کی کوئی چیز ہوتی۔" آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے اس کے تھوڑی سی حساسیت بھی تم میں آ گئی ہے۔" نبیل نے گہری سانس کھینچی۔

"پھر بھی آپ اس سے۔"

"چھوڑو یہ سب باتیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ پھر نیچے چلتے ہیں۔ پتا ہے ایک دو دن میں شکیل چچا آنے والے ہیں سونیا کی شادی کی تاریخ رکھنے۔"

"ہائیں۔ اشعر بھائی آ گئے کیا؟" اس نے فوراً ان کی طرف گھوم کر پوچھا۔

"نہیں' بیس تاریخ کو آ رہا ہے۔"

"تو کیا ان کے آتے ہی شادی ہو گی۔"

"ہاں' چلو باقی معلومات نیچے سے حاصل کرتے ہیں۔"

"میں منہ دھو لوں۔" وہ واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

نبیل اس کا دھیان بٹ جانے پر شکر کرنے لگے تھے۔

❁ ❁ ❁

شاہ سکندر، بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں شاہ جہانگیر کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ بابا جان نے انہیں کس مقصد سے بلایا ہے اور اس بار انہوں نے انجان بننے کی کوشش نہیں کی۔ سلام کر کے بیٹھتے ہی کہنے لگے۔

"بابا جان! اگر صباحت کو لانے کا مسئلہ ہے تو اب آپ کو ڈائریکٹ آسیہ سے بات کرنی چاہیے۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ ہم اس کی مرضی پر چلیں۔" بابا جان نے اپنی ناگواری چھپا کر کہا۔

"مجبوری ہے۔ چلنا پڑے گا۔"

"نہیں' نہیں سکندر! مجبوری ہمارے ساتھ نہیں' اس کے ساتھ ہے۔ ایک بچی ہم اس کی لے کر بیٹھے ہیں اور جو اس کے پاس ہے' وہ بھی اس کی نہیں۔ کیوں جہانگیر ہم غلط کہہ رہے ہیں؟" بابا جان کو شاہ سکندر کا ہتھیار ڈالنے والا انداز قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

"نہیں بابا جان! صباحت' علی کی منکوحہ ہے۔" شاہ جہانگیر نے فوراً ان کی تائید کی۔

"اس سے پہلے وہ میری بچی ہے۔" شاہ سکندر بھی فوراً بولے تھے۔ "مدیحہ کو جس طرح آپ لے کر آئے۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ایسی جرات کرتا تو میں اسے شوٹ کر دیتا۔ اس حویلی میں بیٹیاں اس طرح نہیں بیاہی گئیں اور ہم صباحت کو لانے کے لیے کیا آپ سوالی بن کر نہیں گئے پھر میری بچی کے لیے سوال کرنا آپ کی شان کے خلاف نہیں ہے؟"

"دیکھو نہیں۔ ہم صرف سوال نہیں' تمہارے سامنے پورا دامن پھیلا دیتے ہیں۔" بابا جان ان کے بدلے تیوروں سے اندر ہی اندر ٹھٹک گئے تھے لیکن معاملہ اہم تھا اس لیے فوراً دامن پھیلا دیا تھا۔

"میرے سامنے نہیں بابا جان! ان کی ماں کے سامنے۔ کیونکہ میں بہت پہلے بچیوں کے تمام اختیارات ان کی ماں کو دے چکا ہوں۔" شاہ سکندر نے ناراض لہجے میں کہا تو بابا جان ناگواری سے بولے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر صباحت کو لانے کا خیال بھی چھوڑ دیجئے۔"

[illegible]

"طریقے سے بیاہی جاتی ہیں اور طریقے سے لائی جاتی ہیں' اس طرح گن پوائنٹ پر اٹھا کر نہیں لائی جاتیں۔ میں اب تک اس سارے معاملے میں خاموش رہا اور جہاں ضرورت پڑی وہاں آپ کا ساتھ بھی دیا تو صرف اس لیے کہ میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا تھا کہ میری بیٹی کو خاندان کا نام دینے کے ساتھ آپ نے اس کے بہتر مستقبل کی ضمانت دی تھی۔"

"ہم ابھی بھی ضمانت دے رہے ہیں۔" بابا جان فوراً بولے تھے۔

"لیکن اس کے ساتھ آپ میری غیرت سے بھی کھیل رہے ہیں اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ مدیحہ اور صباحت میری بیٹیاں ہیں۔ خواہ یہاں رہیں یا آسیہ کے پاس' آپ کو ان کے لیے اسی طرح سوچنا ہوگا جیسے الماس، رابعہ اور دوسری بچیوں کے لیے سوچتے ہیں۔ صباحت کو بیاہ کر لانا ہے تو خود چل کر جائیں۔ اگر اس میں آپ اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں تو جہانگیر بھائی کو بھیج دیں۔ میرے وقت میں بھی تو آپ نے انہیں ہی بھیجا تھا لیکن اب کوئی سازش نہیں ہوگی۔" شاہ سکندر نے جانے بیٹیوں کی محبت میں یا اپنی غیرت پر چوٹ پڑنے سے سارے لحاظ بھلا دیے تھے۔

"سکندر!" بابا جان کا ضبط جواب دے گیا۔ "تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ سن رہے ہو جہانگیر! یہ ہمیں اس دو کوڑی کی ڈاکٹرنی کے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔"

"یہ محض آپ کی سوچ ہے بابا جان! اور آسیہ سے بغض۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ لینے کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ صباحت کی جگہ اگر الماس ہو تو کیا آپ مہر النساء سے بات نہیں کریں گے۔" شاید سکندر زچ ہو کر بولے تھے۔

"نہیں۔" بابا جان ہٹ دھرمی سے گویا ہوئے۔ "مہر النساء سے کیوں بات کریں گے۔ ہم اپنے طور پر جو فیصلہ کرتے ہیں۔ اس میں کسی دوسرے فرد کو شامل نہیں کرتے، پوچھ لو جہانگیر سے۔ علی کے معاملے میں' میں نے اس سے بات کی نہ اس کی بیوی سے اور جو کہا انہوں نے وہی کیا۔"

"میں نہیں کر سکتا۔" شاہ سکندر کے صاف انکار پر بابا جان کچھ دیر تک خشمگیں نظروں سے انہیں گھورتے رہے لیکن جب بولے تو لہجہ نارمل تھا۔

"ہم تم سے کچھ کہہ بھی نہیں رہے سکندر!"

شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے رک کر شاہ جہانگیر سے مخاطب ہوئے۔

"جہانگیر بھائی! آپ صباحت کے لیے آسیہ سے بات کر لیجیے۔ وہ اگر اسے رخصت کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ آپ علی کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھیں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل آئے۔ کیونکہ بابا جان کا ردعمل جانتے تھے اور یہ نہیں تھا کہ انہیں پروا نہیں تھی بلکہ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بابا جان کی ضد سے بھی واقف تھے اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا وہ بھولے نہیں تھے لیکن وہی بات کہ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن جب اولاد کی بات آتی ہے تو مصلحت بھی کوئی زیادتی برداشت نہیں ہوتی۔

اور شاہ سکندر اس سارے معاملے میں اگر خاموش رہے تھے تو اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو بابا جان کی ضمانت' دوسرے علی جہانگیر کی ہر لحاظ سے اٹریکٹو پرسنالٹی، تیسری بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے صباحت کو دیکھا نہیں تھا تو اس کے لیے ان کے اندر وہ محبت نہیں تھی جو ساتھ رہنے والی اولاد سے ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ آیا وہ لڑکی شاہ پور آنا بھی چاہے گی یا نہیں۔ گویا اس کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر مدیحہ کی جگہ صباحت

ہی آجاتی تب بھی شاید وہ اسے اہمیت نہ دیتے، خواہ وہ کتنا واویلا مچاتی۔ وہ یہ سوچ کر اطمینان سے رہتے کہ بابا جان نے اس کے ساتھ اچھا کیا۔ خاندان کا نام اور علی جیسا رفیق سفر اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ کیونکہ درمیان میں مدیحہ آگئی تھی، جس کے وجود سے ہی وہ لاعلم تھے۔ اس نے اچانک ان کے اندر سوئی محبت کو یوں بیدار کیا تھا کہ اس کے ساتھ ان کی غیرت بھی جوش میں آگئی تھی اور اب وہ صرف باپ بن کر سوچ رہے تھے تو انہیں بابا جان کا طرز عمل انتہائی نامناسب اور گھٹیا لگ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ صباحت کو لانے کے لیے بابا جان پھر کوئی ایسا پلان بنائیں جس سے بیٹیوں کی نظروں میں وہ بھی بے وقعت ہو کر رہ جائیں۔

گو کہ مدیحہ نے ابھی تک ان پر کچھ جتایا نہیں تھا لیکن وہ اس خیال سے بھی پریشان ہو جاتے تھے کہ کسی دن وہ ان کے مقابل کھڑی ہو گئی تو وہ اسے کیا جواب دیں گے؟

ان کی زندگی میں یہ دوسرا یا شاید تیسرا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جہاں اگلے لمحے کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا اور ذہن بری طرح منتشر ہو جاتا۔

پہلا مرحلہ وہ تھا جب حجلہ عروسی میں مہر و مہرو پکارتے ہوئے وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آگئے تھے۔ دوسری بار جب آسیہ کے ہاتھ میں لفافہ تھمایا تھا۔

اور اب اولاد کے لیے بھی بابا جان ان سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے۔

"ہرگز نہیں۔ مدیحہ اور صباحت لاوارث نہیں ہیں۔ میں ان کا باپ ہیلتھ منسٹر شاہ سکندر حیات' میری اپنی ذاتی حیثیت ہے، شناخت ہے اور میں اپنی شناخت کے ساتھ اپنی بیٹیاں رخصت کروں گا۔" وہ بہت مضبوط ارادے کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے ساتھ مدیحہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"آپ یہاں ہیں بابا! میں آپ کو نیچے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔"

"خیریت؟" انہوں نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں بہت بور ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بند۔ کھانے کے وقت نکلتے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھ سے کتراتے ہیں یا....."

"نہیں بیٹا! آپ سے کیوں کترائیں گے۔ بس سب کا اپنا اپنا مزاج ہے' اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ آپ کی وہاں کیا ایکٹیویٹیز تھیں؟" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں پھر بھی زندگی متحرک تھی۔ صبح ناشتے کے ساتھ ساتھ مما کا لیکچر پھر کالج جانے کی تیاری میں صبا جلدی جلدی کا شور مچاتی رہتی۔ مجھے اسے تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا ہے اور نبیل بھائی کو بھی۔ اور عمر کے ساتھ تو میری بنتی ہی نہیں ہے۔ بہت لڑائی ہوتی ہے ہماری لیکن ہم ناراض نہیں ہوتے۔ بس لڑتے ہیں اور اب تو لڑتے بھی نہیں ہیں کیونکہ میں وہاں نہیں رہتی۔ آپ کو پتا ہے، میں اسلام آباد میں ہوتی ہوں۔ اپنے شکیل ماموں کے پاس۔" اسے شاید سب یاد آرہے تھے جو وہ شوق سے بتانے بیٹھ گئی تھی۔

"کیوں' ان کے پاس کیوں؟" شاہ سکندر نے پوچھا تو وہ اصل بات گول کر گئی۔

"بس مجھے اسلام آباد جانے کا شوق تھا۔ وہاں گئی تو پھر آنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ مما سے ضد کر کے وہیں رہ گئی اور کالج میں ایڈمیشن بھی لے لیا۔ اف میرا تو بہت نقصان ہو گیا۔ ایک ہفتے کی چھٹی تھی اور یہاں ایک مہینہ ہو گیا۔" اسے ایک دم اپنا کالج یاد آگیا۔

"اور کون کون ہے آپ کے شکیل ماموں کے گھر میں؟" انہوں نے ایک خیال کے تحت پوچھا تھا۔

''اس واسطوں تی اور مامی جی تھیں۔ صہیب بھائی کی شادی ہوئی اور اشعر بھائی لندن میں ہیں۔ شاید آنے والے ہوں گے یا ہو سکتا ہے وہیں شادی کر لیں جیسے۔'' وہ روانی میں بتاتی ہوئی یک دم خاموش ہو گئی۔

''اور صباحت' وہ بھی آپ کی طرح ہے؟'' شاہ سکندر چاہتے تھے وہ یوں ہی بولتی رہے' جب ہی اس کے خاموش ہوتے ہی فوراً سوال کر رہے تھے۔

''نہیں' وہ بہت ڈرپوک ہے۔ شادی والے روز اگر میری جگہ وہ مایوں بیٹھی ہوتی اور بندوقیں تنی ہوئی دیکھ لیتی تو اس کا تو وہیں ہارٹ فیل ہو جاتا۔''

وہ صباحت کی تعریف میں ہمیشہ سب سے پہلے اس کی بزدلی کا ذکر کرتی تھی۔

شاہ سکندر اندر ہی اندر جز بز ہوئے اور صباحت کے بارے میں مزید جاننے کا خیال چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اوکے بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جاؤ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔''

''پہلے میرا مسئلہ تو حل کریں۔''

''کیا' کیا مسئلہ ہے؟'' انہوں نے فوراً پوچھا۔

''بوریت۔'' اس نے بوری شکل بنا کر کہا۔

''آپ بتاؤ۔ آپ کا کیا دل چاہتا ہے۔ پڑھنا چاہتی ہو تو اسلام آباد لے چلوں یا نئے سرے سے کہیں اور۔''

''نہیں' مجھے نہیں پڑھنا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''کیوں بیٹا! کم از کم گریجویشن تو کر لینا چاہیے آپ کو۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی نالج میری اب ہے' گریجویشن کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی۔ کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ صرف ڈگری ہاتھ آئے گی۔ کیا کروں گی ڈگری لے کر' نوکری تو نہیں کرنی مجھے۔''

وہ جونشن میں آیا ہوئے جا رہی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شاہ سکندر کا ذہن کہیں پیچھے بھٹک گیا۔ اس نے کہا تھا۔ ''میرے خواب ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے نہیں چھوڑ سکتی۔''

✽ ✽ ✽

گھر میں سونیا کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے لیکن خوشیوں میں بے ساختگی نہیں تھی بلکہ جیسے ہر بات بہت سوچ کر اور سنبھل کر ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو ایک ادائی سے رسمے رسمانے گانے شروع ہو جاتے۔ درمیان میں نہ کوئی چھیڑ چھاڑ ہوتی' نہ ہنسی مذاق۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کی شادی نے جو مسائل پیدا کیے تھے گو کہ اس کی لپیٹ میں سب نہیں آئے تھے لیکن اپنے اپنے طور پر سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ یوں بھی آسیہ پر ان کے تمام بھتیجے بھتیجیاں جان چھڑکتے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی پریشانی کو وہ محسوس نہ کریں۔ حالانکہ آسیہ ظاہر نہیں کرتی تھی اور بھرپور طریقے سے ہر کام میں حصہ لے رہی تھی اور اسی کی طرح صباحت بھی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس خوشی پر اپنے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا سایا بھی نہ پڑنے دے۔ جب ہی کچھ زیادہ ہی خوش دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی پھر بھی سب بہت محتاط تھے۔

سونیا رخصت ہو کر اسلام آباد چلی گئی تو اگلے دن باقی سب گھر والے ولیمے میں شرکت کے لیے روانہ ہو

گئے۔ اس سے گھر ایک دم خالی ہو گیا۔ صرف اماں جی' آسیہ اور مدو تھی۔ اماں جی کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے آسیہ اور اسے اپنا جانا ملتوی کرنا پڑا ورنہ پروگرام تو ان کا بھی تھا اور آسیہ نے اس سے تو بہت کہا کہ وہ بھی چلی جائے لیکن اس کا دل کچھ اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اماں جی کا بہانا کر کے رک گئی کیونکہ آسیہ سارا دن تو گھر میں نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی آسیہ کلینک جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے گیٹ بند کر کے واپس اماں جی کے پاس آ کر بیٹھی اور ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہنے لگی۔

''احمر بھائی آخر نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا مامی جی نے۔ اور سونیا آپی تو بہت رو رہی تھیں۔ انہیں اگر نہیں آنا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ خواہ مخواہ آس دلائی۔''

''ہاں!'' اماں جی نے ہاں کی صورت لمبی سانس کھینچی۔ ''پتا نہیں پردیس کی مٹی کیسی ہے؟ سارے رشتے بھلا دیتی ہے۔''

''احمر بھائی ایسے تو نہیں تھے اماں جی! وہ تو سب سے بہت محبت کرتے تھے اور ذمہ دار بھی بہت تھے۔'' وہ ان دنوں میں کھو کر بولی جب احمر یہاں تھا۔

اماں جی پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی بات پر بس ہوں کر کے رہ گئیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی پھر آہستگی سے ان کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں آ بیٹھی اور احمر ہی کو یاد کرتے ہوئے وہ جانے کیا کیا سوچنے لگی تھی۔

''اگر احمر بھائی وہاں شادی نہ کرتے تو شاید یہ حالات نہ ہوتے۔ اس کے برعکس جیسے اشعر بھائی اور ان کی ایک ساتھ منگنی ہوئی تھی تو اب شادی بھی دونوں کی ساتھ ہی ہوتی۔ سونیا بھی رخصت ہوتیں اور مدو یہاں بیٹھی ہوتی' دلہن بنی ہوتی۔ بہت غلط کیا احمر بھائی نے۔ انہیں شاید مدو سے محبت تھی ہی نہیں۔ محض دل لگی یا۔۔۔'' فون کی بیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں اور اماں جی کی نیند خراب ہونے کے خیال سے اس نے بھاگ کر ریسیور اٹھایا تھا۔

''ہیلو۔''

''کون مدو' کیسی ہو؟'' دوسری طرف وہی تھا جسے ابھی وہ یاد کر رہی تھی اور اس کے منہ سے مدو سن کر وہ جتا کر بولی۔

''جی نہیں' میں صبا ہوں اور اتفاق سے ابھی آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''اچھا!'' احمر وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''پھر یہ نہیں کہوں گی۔ بڑی عمر ہے تمہاری؟''

''کیوں نہیں۔ اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔''

''ہشت بے وقوف۔ چلو ذرا اماں جی کو بلاؤ۔'' احمر نے پیار بھری سرزنش کے ساتھ کہا۔

''ماں جی نہیں ہیں بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ سب اسلام آباد گئے ہیں ولیمے میں۔ آپ کیوں نہیں آئے؟'' اس نے جتا کر پوچھا۔

''بس یار! چھٹی نہیں ملی اور تم کیوں نہیں گئیں؟''

''اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس لیے مما اور میں نہیں گئے۔''

''اور مدو! اچھا ہاں وہ تو وہیں ہوگی ہے نا۔'' احمر نے ایک دم یاد آنے پر کہا تھا۔

''نہیں' مدو تو شاہ پور میں ہے۔ شاہ سکندر کے پاس۔''

''کیوں' کیا مطلب ہے۔ وہاں کیوں چلی گئی' اور جو مجھے بتایا ہی۔۔۔''

"جی!" اس نے اختصار سے کام لیا۔

"یقیناً بہت ضد کی ہوگی اس نے۔ ضدی تو وہ شروع سے ہے۔ آئے گی کب؟" احمر نے مدیحہ کے اس اقدام پر تاسف کا اظہار کر کے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کر دی۔

"پتا نہیں۔"

"اچھا میں پھر فون کروں گا۔ کب تک آئیں گے سب لوگ؟"

"آج کل میں آنے والے ہیں۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" وہ ریسیور رکھ کر پلٹی تھی کہ پھر بیل بج اٹھی۔

"ہیلو۔" اس بار اس نے کچھ بیزاری سے ریسیور اٹھایا تھا۔

"میں شاہ پور جا رہا ہوں۔ مدیحہ کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔" دوسری طرف علی تھا۔ بغیر سلام دعا کے چھوٹتے ہی بولا اور اس کا دماغ بھنبھنا گیا۔ حسب سابق ریسیور پٹخنے لگی تھی کہ اچانک کسی خیال کے تحت رک گئی لیکن بولی کچھ نہیں اور اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔

"ہیلو صباحت!" قدرے توقف سے ادھر سے وہ پکار کر کہنے لگا۔ "خفگی ناراضگی بجا ہے لیکن پلیز میری بھی تو کچھ سنو۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟"

اس نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

"سنو! اگر تم پر اس سلسلے میں کوئی پابندی لگائی گئی ہے تو میں آ جاتا ہوں۔ اب تو آ سکتا ہوں' اپنی منگیتر سے ملنے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا۔" آخر میں اس نے اس کی خاموشی توڑنے کی سعی کی۔

جواب میں اس نے ریسیور رکھ دیا اور اس کی دیدہ دلیری پر تلملاتی ہوئی دوبارہ اماں جی کے پاس جا بیٹھی تھی اور کچھ دیر پہلے جس انداز سے احمر کے بارے میں سوچ رہی تھی اب اس کی جگہ شاہ علی جہانگیر آ گیا تھا۔

پھر تیسرے روز سب لوگ اسلام آباد سے واپس آ گئے' کیونکہ سب کام کاج والے تھے۔ بس ایک وہ اور ثوبیہ ہی فارغ تھی۔ ثوبیہ کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ میڈیکل میں جانے کا تھا اور رزلٹ تو اس کا ابھی ابھی نہیں آیا تھا لیکن فورتھ ایئر میں ایڈمیشن شروع ہو چکے تھے اور اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آسیہ نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ یعنی اس کی پڑھائی کے متعلق اور خود چاہتی تھی کہ وہ بارہ سے کالج جانا شروع کر دے لیکن آسیہ سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں آسیہ کے مزاج کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کر سکتی، کبھی بہت مہربان اور کبھی ذرا سی بات پر ہتھے سے اکھڑ جاتی۔ اس لیے وہ ضرورت کے علاوہ ضروری بات بھی بہت سوچ کر کرنے لگی تھی اور گو کہ ایڈمیشن بہت ضروری تھا وہ ڈر رہی تھی اور بہت ہمت کرنے پر آسیہ سے نہیں کہہ سکی اور نبیل کے پاس چلی آئی۔

"نبیل بھائی! بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میں بی اے کر لوں۔" اس نے نبیل کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً تائید کرتے ہوئے بولے۔

"بالکل' تمہیں پڑھنا چاہیے۔"

"تو پھر آپ مما سے کہیں نا۔"

"کیوں' وہ منع کر رہی ہیں کیا؟"

"نہیں تو۔ وہ میرا مطلب ہے' میں نے ان سے بات نہیں کی۔ مجھے ڈر لگتا ہے نبیل بھائی! شاید وہ منع کر دیں گی۔" اس نے کچھ الجھ کر اپنا خدشہ ظاہر کیا تو نبیل سمجھ کر بولے۔

"میرا خیال ہے وہ پڑھنے سے نہیں روکیں گی۔ خیر میں بات کروں گا۔ ایڈمیشن تو ہو رہے ہیں۔ تم لیٹ تو نہیں ہو گئیں۔ پہلے خیال کیوں نہیں آیا تمہیں؟"

"آیا تھا لیکن مما سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتی ہیں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"بے وقوف! تمہیں ان سے شاکی نہیں ہونا چاہیے۔ جانتی تو ہو وہ کتنی پریشان ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں مدحو کی فکر ہے۔" نبیل نے دھیرج سے اسے ٹوک کر کہا تو وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

"آپ تو کہتے تھے نبیل بھائی کہ مدحو گھر کے علاوہ اور کہیں بھی زیادہ دن نہیں رو سکتی۔"

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔" نبیل فوراً بولے۔

"بس کریں بھائی! اتنے دن تو ہو گئے ہیں۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔ کبھی نہیں آؤں گی۔"

"سنتی رہو اس کی باتیں۔ وہ نارمل نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یہی سب کرتی رہی ہے کہ کسی نہ کسی سبب سب اس کے لیے پریشان رہیں۔ جس دن اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سب اس سے بے پروا ہو گئے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" نبیل نے کہا تو اسے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔

"ہائے نہیں نبیل بھائی! اس سے تو وہ اور چڑ جاتی ہے۔"

"کب تک چڑے گی؟"

"بس جانے دیں۔ یہ بتائیں۔ آپ مما سے کب بات کریں گے میرے کالج جانے کے سلسلے میں۔" وہ پھر اپنی بات پر آ گئی۔

"صبح ہی اور تم بس تیار رہو۔ مجھے یقین ہے پھوپھو منع نہیں کریں گی۔ بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہوں گی کہ تم نے پہلے کیوں نہیں یاد دلایا۔"

نبیل نے بات کے اختتام پر خالی کپ اٹھا کر اسے یوں تھمایا جیسے اب تم جاؤ یہاں سے اور وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی پھر دروازے کے قریب رک کر پوچھنے لگی۔

"نبیل بھائی! آپ مدحو کے لیے سنجیدہ ہیں نا؟"

نبیل نے بہت بری طرح اسے گھورا تھا۔

وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

✿ ✿ ✿

وہ بی بی جان کو ڈھونڈتی ہوئی پہلے ان کے کمرے میں' پھر ہال میں دیکھنے کے بعد بابا جان کے خاص کمرے کی طرف آئی تھی لیکن دروازے کے پاس ہی رک گئی کیونکہ اندر سے بابا جان کے تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر سوچا پھر اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے واپسی پلٹی تھی کہ بابا جان کی آواز پر پھر رک گئی اور بہت آہستہ سے دروازے کے قریب ہو کر سننے لگی۔

"سکندر کا دماغ خراب ہے۔ کہتا ہے' ہم اس ڈاکٹر نی کے پاس جائیں اور اس پر بھی اس کی مرضی کہ وہ بیٹی دے یا نہ دے۔ ہونہہ۔"

"بہت خیال کر لیا ہم نے سکندر کا۔ اب نہیں کریں گے۔" بابا جان کی آواز وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ غالباً غصے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے اور جانے اندر اور کون کون تھا۔

"تم پہلی فرصت میں اس عورت کو پیغام بھیجو کہ مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو فوراً علی کی منکوحہ اس کے پاس پہنچا دے۔"

"میرے خدا!" اس نے بہت دہل کر بند دروازے کو دیکھا تھا۔

"اور سنو مدیحہ پر کڑی نظر رکھو۔ وہ ضرور اپنی ماں کو فون کرتی ہو گی۔ ہم علی کا مسئلہ حل کر لیں پھر اس کے بارے میں بھی سوچتے ہیں۔"

وہ اسی طرح سہمی ہوئی الٹے قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی تھی پھر راہداری کے موڑ پر تیزی سے پلٹتے ہوئے علی جہانگیر سے ٹکرا گئی اور اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ بلند ہوتی جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا۔

"کیا بات ہے؟" علی جہانگیر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ بولنے سے قاصر تھی۔ نفی میں سر ہلایا پھر بے اختیار علی جہانگیر کا بازو مضبوطی سے تھام کر کھینچتی ہوئی لاؤنج میں لے آئی اور اسے صوفے پر دھکیل کر یوں دیکھنے لگی جیسے آیا وہ قابل اعتبار ہے کہ نہیں۔

"کسی نے کچھ کہا ہے۔ بابا جان نے۔" علی جہانگیر نے پوچھا پھر خود ہی قیاس کیا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔ وہ میں بارہ دری کی طرف نکل گئی تھی۔ ڈر گئی۔" اسے فوری طور پر جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔

"کس سے۔ کون تھا وہاں؟"

"بھوت! وہ جو گھنا سا پیڑ ہے نا اس میں جھانک رہا تھا۔" وہ اب اپنی بات پر قائم رہنے کے لیے پوری کہانی گھڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔

"اچھا۔ کچھ کہا تو نہیں اس نے تمہیں؟" علی جہانگیر نے بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھا۔

"نہیں۔" وہ نظریں چرا کر سیدھی ہو گئی پھر ایک دم خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ "آپ کراچی سے آ رہے ہیں؟"

"ہاں اور صبح واپس بھی جانا ہے۔ سکندر چچا یہیں ہیں یا کہیں ٹور پر نکلے ہوئے ہیں؟"

"یہیں ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے انہیں اپنے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ ادھر چلے جائیں۔"

"پہلے بابا جان سے مل لوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے جاتے رک کر بولا۔ "میں نے صباحت سے پوچھا تھا کہ تمہارے لیے کوئی پیغام ہو تو۔"

"آپ کی ملاقات ہوئی اس سے؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے فون کیا تھا۔ البتہ نبیل بھائی سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوا ہوں اور ان کم لوگوں میں ایک فرد کا اضافہ نبیل بھائی۔ ہی از ویری جینئس۔" اس نے کہا تو وہ بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"میری جگہ اگر صبا ہوتی تو نبیل بھائی کی تعریف پر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ اوکے اب جائیں ملیں اپنے بابا جان سے اور دیکھیں انہوں نے آپ کی شادی کی دوسری اور آخری قسط کا پلاٹ تیار کیا کہ نہیں۔"

وہ اس کی دوسری بات پر جز بز ہو کر آگے بڑھ گیا۔

"اف، کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی ہار کو جیت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ بابا جان کی باتوں کو سوچتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا تھا۔

"اور اب تو میں مما کو فون کر کے خبردار بھی نہیں کر سکتی۔ کتنی مجبور ہوں گی مما۔ اگر انہوں نے میری وجہ سے صبا کو بھیج دیا تو پھر وہ کبھی ہم دونوں کو نہیں دیکھ سکیں گی۔ ان لوگوں کو مجھ سے اور صبا سے کوئی محبت نہیں ہے بلکہ یہ تو سرے سے ہمارا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں مٹانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔"

وہ یہی سب سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر جا کر سوئی تھی پھر بھی صبح بہت جلدی اٹھ گئی اور یقیناً اس کے اندر کا خوف تھا جس نے اسے گہری نیند سونے نہیں دیا تھا۔ دل و دماغ دونوں بوجھل ہو رہے تھے۔ منہ پر پانی کے چند چھینٹے مار کر وہ ہاتھوں ہی سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی دوبارہ کمرے میں آئی اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی سے پردے ہٹائے تو نیچے لان میں شاہ سکندر اور علی جہانگیر ایک ساتھ چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ اسے لگا جیسے وہ دونوں بابا جان کے اگلے پلان پر بات کر رہے ہوں۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر دوپٹہ اٹھا کر کمرے سے نکلی اور سیڑھیاں پھلانگ کر بھاگتی ہوئی ان کے پاس چلی آئی۔

"گڈ مارننگ بابا!"

"مارننگ! آج آپ جلدی اٹھ گئیں!" شاہ سکندر رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"جی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ میرے اٹھنے سے پہلے کہیں آپ نکل نہ جائیں۔ رات آپ کوئٹہ جانے کی بات کر رہے تھے نا۔" اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔

"ہاں لیکن آج تو میرا جانا کنفرم نہیں تھا۔ دوپہر میں البتہ کراچی جاؤں گا۔ علی تم بھی میرے ساتھ ہی نکلنا۔" اسے بتا کر وہ علی سے مخاطب ہوئے۔

"جیسے آپ کہیں۔ انہیں بھی لے چلتے ہیں۔ یہ یہاں ڈرتی ہیں۔ کل شاید کوئی بھوت وغیرہ دیکھ لیا تھا۔" علی جہانگیر نے شرارت سے اسے دیکھا تو بے ساختہ بولی۔

"وہ تو میں ابھی بھی دیکھ رہی ہوں۔"

شاہ سکندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر چلتے ہوئے بولے۔

"میری بیٹی بہت بہادر ہے۔"

"وہ بابا! آپ کراچی جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔" وہ فوراً اصل بات کی طرف آ گئی۔

"آج نہیں بیٹا پھر کسی دن۔" شاہ سکندر نے بہت نرمی سے آہستہ سے ٹالا۔

"نہیں بابا! میں آج ہی جاؤں گی۔ مجھے۔" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ورنہ کہنے جا رہی تھی کہ مما بہت یاد آ رہی ہیں۔

"علی! تمہاری پرموشن کا کیا ہوا؟"

شاہ سکندر اس کی بات ان سنی کر کے علی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ سمجھ گئی کہ

وہ اسے لے جانا نہیں چاہتے اور وجہ تو وہ جان ہی گئی تھی۔ البتہ شاہ سکندر سے کچھ امید تھی کہ وہ اگر بابا جان کے اگلے پلان سے آگاہ ہو گئے تو شاید وہ خود ہی اسے یہاں سے نکال لے جائیں گے لیکن انہوں نے منع کر کے نہ صرف اس کی امید توڑ دی بلکہ اسے شاکی بھی کر دیا تھا۔

اس نے بہت غیر محسوس طریقے سے اپنے کندھے سے شاہ سکندر کا ہاتھ ہٹا دیا اور اسی طرح پہلے ان سے دو قدم پیچھے ہٹی پھر رک کر انہیں علی جہانگیر کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

کافی آگے جا کر شاہ سکندر واپس پلٹے تو انہیں دوبارہ اپنی طرف آتے دیکھ کر حرکت میں آ گئی۔ کیاری کے پاس جا کر کچھ پھول توڑے اور ان کا گلدستہ بنانے لگی۔ بظاہر وہ بڑے انہماک سے اس کام میں مصروف تھی لیکن اس کا ذہن کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا تھا جو شاہ سکندر اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو جائیں۔

❁……❁……❁

اس نے کالج جوائن کر لیا تو اب آنے جانے کا مسئلہ ہو گیا تھا۔ پہلے مدیحہ اور ثوبیہ ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ اب وہ دونوں نہیں تھیں۔ مدیحہ تو پہلے ہی اسلام آباد چلی گئی تھی اور ثوبیہ رزلٹ کے بعد میڈیکل میں جانے والی تھی۔ یوں اس کا راستہ الگ ہو گیا تھا اور وہ کیونکہ کبھی اکیلی نہیں گئی تھی، اس لیے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ جس پر آپیہ نے اسے باقاعدہ لیکچر دینے کے ساتھ ڈانٹا بھی تھا کہ وہ اب بچی نہیں ہے جو ابھی بھی انگلی پکڑ کر چلے گی۔ اسے ابھی سے عادت ڈالنی چاہیے ورنہ زندگی میں کچھ نہیں کر سکے گی اور وہ آپیہ کے سامنے تو خاموش ہو گئی لیکن پھر نبیل کو راضی کر لیا وہ صبح ان کے ساتھ جایا کرے گی۔ البتہ واپسی کا کوئی زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ کالج سے کافی لڑکیاں نکلتی تھیں۔

یوں کچھ دنوں میں وہ سیٹ ہو گئی تھی کہ کسی دن نبیل دیر کرتے تو وہ صبح بھی خود ہی نکل جاتی۔ ان دنوں اس پر پڑھنے کے علاوہ مزید کچھ کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بالکل آپیہ کی طرز پر سوچنے لگی تھی کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہو گی جیسی اس کی ماں نے گزاری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ بن جائے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے نبیل کے سامنے کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹالا تھا کہ پہلے بی اے کر لو پھر سوچنا۔

"وہ تو میں کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی کورس کر لوں تو کیا برا ہے؟"

"برا تو کوئی نہیں ہے لیکن تمہیں جلدی کیا ہے۔ بہت وقت ہے تمہارے پاس۔ بی اے کے بعد ایم اے کرنا بلکہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ایم اے میں پوزیشن لے کر لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کرو۔"

نبیل نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ جو کہ اس وقت تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا لیکن اب میڈم عاصمہ کو دیکھ کر وہ نہ صرف نبیل سے اتفاق کر رہی تھی بلکہ اندر سے اتنی پرجوش ہو گئی تھی کہ دل چاہ رہا تھا جلدی جلدی کلاسیں پھلانگتی ہوئی میڈم عاصمہ جیسی بن جائے۔

"کتنی پیاری ہیں میڈم عاصمہ! اللہ اگر نبیل بھائی مان جائیں تو میں کہوں گی ان سے بلکہ مما سے بات کروں گی۔ آج ہی۔"

وہ ایک خوش کن تصور لیے جانے کیا کچھ سوچتی آ رہی تھی کہ قریب گاڑی رکنے کے ساتھ یوں دروازہ کھلا کہ اس کا راستہ رک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹ کر کنارے سے نکلتی، دوسری طرف سے نکل کر علی جہانگیر اس کے سامنے آ گیا۔

"السلام علیکم۔"

"آپ۔" وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

"ڈرو مت۔ بیٹھ جاؤ۔" علی جہانگیر نے نرمی سے کہا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی تھی کہ علی جہانگیر نے ایک دم اس کی کلائی تھام لی اور اس بار تحکم سے بولا۔

"تماشا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو بیٹھو۔" اس کے ساتھ ہی اسے گاڑی کے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا پھر دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ بہت ضبط سے دانتوں پر دانت جما کر بولی۔

"مجھے میرے گھر ڈراپ کر دیں۔"

"جو حکم۔" اس نے اسپیڈ سے گاڑی بھگا دی۔

وہ حقیقتاً اندر سے کانپ رہی تھی لیکن اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے رخ موڑ کر خود کو سہارا دینے میں لگی رہی۔ جب کافی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تب راستوں کو دیکھ کر پھر پریشان ہو گئی۔

"یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"گھر۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "تم ہی نے گھر چلنے کو کہا ہے ورنہ میرا ارادہ تو کہیں اور جانے کا تھا۔"

"میں اپنے گھر جاؤں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔

"یہی تمہارا گھر ہے۔" اس نے اپنے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن بجایا اور گیٹ کھلنے پر اسے دیکھ کر بولا۔

"مجھے افسوس ہے اس وقت تمہارے استقبال کو یہاں کوئی نہیں ہے لیکن میں تو تمہارے ساتھ ہوں ناں اور جب ساتھی مضبوط ہو تو باقی ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"آؤ۔" وہ گاڑی اندر لے آیا اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ تھاما تو وہ چاہنے اور کوشش کے باوجود مزاحمت نہیں کر پائی۔ کیونکہ ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا اور ہاتھ پاؤں الگ سن ہو گئے تھے۔

"آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے جوس لے آتا ہوں۔" وہ سیدھا اسے اپنے بیڈروم میں لے آیا تھا اور اس کے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر فوراً جوس لینے نکل گیا۔ تو چند لمحوں بعد جانے کس خیال سے اس نے زور سے جھرجھری لی پھر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے تک گئی تھی کہ قدموں کی آواز سن کر جلدی سے بیڈ کے دوسری طرف آ گئی اور اپنے دفاع کے لیے اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا۔

"ہے تو یہ کھانے کا وقت لیکن۔" وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی بولنے لگا تھا لیکن اسے کھڑے دیکھ کر پہلے خاموش ہوا پھر شوخ و معنی خیز انداز میں مسکرایا تو اس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ جن سے اس کی ناگواری اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کم آن یار! یہ ضروری تو نہیں ہے کہ جیسا ہم سوچیں' چاہیں ویسا ہی ہو۔ کبھی کبھی۔" وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر بڑے دلکش انداز میں کہتا ہوا اس کی طرف آنے لگا تھا کہ وہ ایک دم حرکت میں آ گئی اور کارنر سے کانچ کا نازک سا گلدان اٹھا کر اسے کارنر کے کنارے پر دے مارا اور اسی تیزی سے ٹوٹے کانچ اپنی مٹھی میں بھر کر بولی تھی۔

"شاہ علی جہانگیر! اگر آپ نے مزید ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو میں یہ سارے کانچ اپنے حلق سے نیچے اتار لوں گی۔"

علی جہانگیر کے قدم وہیں رک گئے تھے۔

* * *

اس کی بند مٹھی سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ ہتھیلی میں کانچ چبھ رہے تھے۔ تکلیف بھی ہو رہی تھی پھر بھی وہ اس طرح کھڑی تھی۔ بہت چوکنا۔

علی جہانگیر اس کے خطرناک تیوروں کے ساتھ ارادے کی مضبوطی سے خائف ہو گیا تھا۔ یہ ہرگز وہ لڑکی نہیں تھی جو ذرا سا تیز بولنے سے سہم جاتی تھی اور اس کی اس تبدیلی کا سبب خواہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت یہ سب سوچنے سے قاصر تھا۔ اس کا ذہن صرف اس صورت حال پر قابو پانے کی سوچنے لگا تھا۔

''دیکھو تمہارا ہاتھ زخمی ہو رہا ہے۔ پھینکو یہ سب۔'' وہ اس کی لہو ٹپکاتی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''نہیں آپ ہٹ جائیں سامنے سے اور جب تک میں باہر نہ نکل جاؤں آپ اس کمرے سے نہیں نکلیں گے۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''رکو صباحت! میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک تم نہیں چاہو گی میں تم پر کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ میرا اعتبار کرو اور اس طرح مت جاؤ۔''

''اعتبار!'' وہ تلخی سے کہہ کر ہونٹ بھینچ گئی۔

''او گاڈ! میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ سنو تمہیں خود اپنے آپ پر تو بھروسا ہے نا۔ پھر کیوں ڈرتی ہو؟''

علی جہانگیر نے زچ ہو کر کہا پھر ایک دم جھپٹ کر اس کی کلائی تھام لی تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور دوسرے پل پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

''پاگل مت بنو صبا اپنا ہاتھ دیکھو۔''

علی جہانگیر نے مجبور ہو کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا اور اس کا بازو گھٹنے کے نیچے دبا کر بہت احتیاط سے اس کی بند مٹھی کھولی تو ایک لمحہ کو وہ خود بھی چکرا گیا تھا۔ کتنے کانچ اس کی ہتھیلی میں اندر تک چلے گئے تھے۔

''خبردار ہلنا نہیں۔'' وہ اسے دیکھ کر تیز لہجے میں بولا تو اس نے دوسرا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا کیونکہ وہ سمجھ گئی کہ اب اس کی کوئی بھی کوشش نہ صرف بے کار ہو گی بلکہ اسے مجبور اور بے بس بھی ظاہر کر دے گی جو کہ وہ نہیں چاہتی تھی۔

وہ دوبارہ اس کے ہاتھ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت آرام و احتیاط سے ایک ایک کانچ نکالنے لگا۔ گاہے بگاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا جو نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بہت ضبط کر رہی تھی۔ پھر بھی کسی وقت اس کے منہ سے ''سی'' کی آواز نکل جاتی۔

''چلو آج یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم کتنی بہادر ہو۔'' وہ آخری کانچ نکال کر اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر دوسرے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر لایا اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو کانچ مجھے نظر آئے وہ میں نے نکال دیے ہیں اور اب خون صاف کر کے ٹیوب بھی لگا دوں گا لیکن تم اس پر اکتفا مت کر لینا آئی مین ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔ کہو تو ابھی لے چلوں۔''

''نہیں۔'' وہ بس ایک لفظ کہہ کر پھر ہونٹ بھینچ گئی۔ جبکہ آنکھوں سے بازو ابھی نہیں ہٹایا تھا۔

''چلو اپنی مما کو دکھا دینا۔ ویسے کیا کہو گی ان سے؟'' دوسری بات پر وہ خود ہی محظوظ ہو کر مسکرایا تھا۔

پھر روئی میں اسپرٹ لگا کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا اس کے بعد ٹیوب پھیلا کر ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں چلا گیا تو اس نے پہلے آنکھوں سے ذرا سا بازو ہٹا کر دیکھا اور اسے موجود نہ پا کر فوراً اٹھ کر بیٹھی تھی

کہ وہ تولیے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا آ گیا اور بہت انجان بن کر بولا۔

''کیا ہوا؟''

''میں گھر جاؤں گی۔'' وہ تنی ہوئی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

''میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ لیکن اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ترخ کر بولی۔

''بیٹھ جاؤ آرام سے یا چلو پہلے کھانا کھا لیں۔ اس کے بعد بات کریں گے۔''

''مجھے نہیں کھانا اور نہ میں آپ کی کوئی بات سنوں گی۔'' اس کے لہجے میں ضد اور خفگی تھی۔

''سنو یہ طے ہے کہ میں اپنی بات کہے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ آج جانا چاہو یا چار دن بعد۔'' وہ ہنوز اسی سنجیدگی سے کہتا ہوا آرام سے صوفے پر جا بیٹھا اور ٹیبل سے سگریٹ اٹھا کر سلگانے لگا تو وہ اس کا مطلب سمجھ کر بری طرح سلگ کر بولی۔

''کیا، کیا بات کہنی ہے آپ کو؟''

''اس طرح نہیں۔ یہاں آ کر بیٹھو۔'' اس نے اطمینان سے اپنے برابر اشارہ کیا تو وہ کچھ دیر تک خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس صوفے کے دوسرے کنارے پر خاصے تکلف سے بیٹھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں بولی۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ جو آپ کہیں گے میں یقین کر لوں گی؟''

''اس کے لیے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم صرف سچائی سن لو اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے کرنا۔'' وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

''سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ آپ شاہ جہانگیر حیات کے بیٹے ہیں اور آپ نے مجھ سے اس حقیقت کو چھپایا۔''

''صرف اس خوف سے کہ کہیں میں تمہیں کھو نہ دوں۔'' جس طرح وہ فوراً بولی تھی۔ اس طرف سے بھی فوری جواب آیا تھا۔ پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

''یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور اپنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا اور اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر آسیہ کی بیٹی ہو جس روز تم گلدان کے پیسے دینے یہاں آئی تھیں اگر تمہیں یاد ہو تو یہاں بابا جان موجود تھے۔ ان کے ساتھ باتوں میں تم نے انہیں بتایا تھا کہ تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہو اور بس سارا کھیل وہیں سے شروع ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں اس کھیل میں شامل ہی نہیں تھا لیکن میں ایسا چاہتا نہیں تھا۔ اس لیے اس تمام عرصے میں بارہا میں نے سوچا کہ تمہیں ساری حقیقت بتا دوں لیکن تمہاری بزدلی کو دیکھتے ہوئے میں نے مجبوراً خود کو باز رکھا کیونکہ تم میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلے کرنے کی جرات ہی نہیں تھی ورنہ میں اسی بہانے تمہاری محبت آزما سکتا تھا۔ تم پہلے مرحلے پر ہتھیار ڈالنے والوں میں سے ہو صباحت شاہ اور اپنی اس خوبی یا خامی سے تم خود بھی اچھی طرح آگاہ ہو۔ پھر بتاؤ میں خاموش نہ رہتا تو کیا کرتا؟'' وہ کچھ دیر کے بعد خاموش ہو گیا کہ شاید وہ بولے گی لیکن وہ کچھ گم صم سی بیٹھی تھی۔

''شاید تمہارے لیے محبت سے دستبردار ہونا آسان ہے اس لیے اپنے اختیارات تم نے اپنے بڑوں کو سونپ رکھے ہیں۔'' اسے بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر وہ مزید گویا ہوا تھا۔ یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے صبا اس لیے کہ

ہمارے بڑوں کے پیش نظر ہماری بہتری نہیں ہے بلکہ انا پرستی میں وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دونوں تو ان کی بساط پر محض مہرے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جذبات، ہمارے احساسات، ہماری محبت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صرف اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جس میں ایک جیتے گا دوسرا ہارے گا تو جیتنے والا اپنی جیت کی خوشی میں اور ہارنے والا اپنی ہار کے غم میں یہ کبھی نہیں سوچے گا کہ اس میں ہم دونوں کا کتنا نقصان ہوا۔

ان باتوں سے میرا مقصد تمہیں تمہارے بڑوں کے خلاف اکسانا نہیں ہے صبا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم محض تماشائی مت ہو۔ تمہاری مما کو یہ خدشہ ہے ناکہ کہیں ان کی کہانی نہ دہرائی جائے تو اس کے لیے وہ مجھ سے اپنی مرضی کی شرائط طے کر سکتی ہیں۔ تم انہیں بتاؤ تو کہ تم مجھے سے۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گیا پھر گہری سانس کے ساتھ اپنے آپ سے بولا تھا۔

"پتا نہیں، تمہیں مجھ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔"

"محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ناجائز کا فرق ہی بھلا دیا جائے۔" وہ جن سوچوں میں تھی، ان میں گم رہ کر بولی تھی۔

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے تم میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں اس دھاندلی میں شریک نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہیں شاہ پور میں ہوتیں۔" وہ اس کے ایک جملے سے زچ ہو گیا تھا اور وہ شاہ پور کے نام سے اچھل پڑی۔

"آپ نے جو کہنا تھا کہہ لیا اب مجھے جانے دیں۔"

"مائی گاڈ! اتنی دیر سے میں کیا صرف بکواس کر رہا تھا۔ کم از کم اس پر کچھ تبصرہ تو کر دو یا سوچنے کا ہی کہہ دو۔" علی جہانگیر نے بڑی آس سے اسے دیکھا تو وہ یہاں سے نکلنے کی جلدی میں اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"ہوں، سوچوں گی ضرور۔"

"گڈ، پھر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں فون کروں گی۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں انتظار کروں گا اور ہاں جاؤ گی کیسے۔ میں چھوڑ آؤں؟" اس نے بڑے سادہ سے انداز میں آفر کی تھی۔

"نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ میرا بیگ شاید آپ کی گاڑی میں ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو۔" اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر اس سے بیگ لیتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"مدیحہ کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک اور بہت خوش۔" وہ جانے کس خیال کے تحت مسکرایا تھا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ اس کی مسکراہٹ پر عجیب سا محسوس کرتی ہوں فوراً گیٹ پار کر آئی تھی۔

۞ ۞ ۞

جب وہ گھر میں داخل ہوئی آسیہ اور نبیل پریشانی سے ٹہل رہے تھے کیونکہ اسے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی۔ اسے خود بھی احساس تھا اور اپنے طور پر انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس نے تمام راستے بہت کچھ سوچ لیا تھا پھر بھی آسیہ کو دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا گئی۔ اس پر آسیہ کا پوچھنا۔

"کہاں رہ گئی تھیں؟"

"وہ مما! میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ یہ میرا ہاتھ دیکھیں۔" اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا جسے دیکھ کر آسیہ نرم پڑ گئی اور فوراً اس کی کلائی تھام لی۔

"کیسے ہوا اور کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ اس میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کانچ چبھ گئے تھے۔"

"نبیل بیٹا! میرا باکس لاؤ۔" آسیہ اس کی ہتھیلی کو انگلی سے چھو کر دیکھ رہی تھی ایک دو جگہ کانچ کی چبھن محسوس ہوئی تو نبیل کو مخاطب کر کے بولی۔

نبیل باکس لے آئے پھر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کم از کم فون تو کر دیتیں۔"

"مجھے ہوش نہیں تھا اور جب ہوش آیا تو فوراً چل پڑی۔" وہ نبیل کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ اس کا جھوٹ فوراً پکڑ لیتے ہیں۔

"کہاں ہوا تھا ایکسیڈنٹ؟" آسیہ نے باکس میں سے کاٹن اور بینڈیج نکالتے ہوئے پوچھا تو وہ اندر ہی اندر پریشان ہو کر کہنے لگی۔

"کالج کے پاس اور اچھا ہوا کچھ کالج فیلوز ساتھ تھیں اور ان کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔" پھر مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر دوسرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر بولی۔ "مجھے بھوک بہت لگ رہی ہے۔ آپ نے کھانا کھا لیا؟"

"ہاں انجیل، بوا سے کہو اس کے لیے کھانا گرم کر دیں۔"

آسیہ نے اسے جواب دے کر نبیل سے کہا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پر بینڈیج کرنے لگی جب تک یہ کام مکمل ہوا تب تک ادھر کھانا بھی گرم ہو گیا تھا اور اس بہانے سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔ دایاں ہاتھ زخمی ہوا تھا اس لیے بائیں ہاتھ سے کھانے میں اسے کچھ دیر لگی اور کچھ اس نے جان بوجھ کر دیر لگائی تاکہ آسیہ کلینک کے لیے نکل جائے۔ پانچ تو بج رہے تھے۔ نبیل بھی اس وقت ٹیوشن کے لیے جاتے تھے۔ یوں ان دونوں کے جانے سے ایک طرح سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ جس پر وہ شکر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور ان چند گھنٹوں میں جو کچھ پیش آیا اسے پہلے مرحلے سے سوچنے لگی تو کہیں اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اور کہیں سہم سا گیا۔ گویا متضاد کیفیات تھیں۔ انہیں سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید تھکن کے باعث، ورنہ یہ کوئی سونے کا وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی اور پتا نہیں بوا نے اسے نماز کے لیے اٹھایا کہ نہیں وہ آٹھ بجے نبیل کے اٹھانے پر اٹھی تھی۔

"اس وقت سونے کا کیا تُک ہے۔ بقیہ رات کیا جاگنے کا پروگرام ہے؟" نبیل نے ٹوکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں کیسے سو گئی۔ مما آ گئیں کیا؟"

"نہیں ابھی آٹھ بجے ہیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ لیکن تمہارا تو ہاتھ۔"

"شکر ہے دوسرا ہاتھ سلامت ہے۔" وہ کہتی ہوئی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو نبیل کو اپنی جگہ پر نیم دراز دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ آپ ہو رہے ہیں؟"

"نہیں۔" نبیل اپنے آپ میں آگئے۔ سیدھے ہو بیٹھے۔ "تمہارے ہاتھ میں تکلیف تو نہیں ہے؟"

"ہے تو لیکن زیادہ نہیں ہے۔" اس نے کہا اور پھر یہ سوچ کر کہ جب وہ سب جانتے ہیں تو انہیں یہ بھی بتا دینا چاہیے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میرا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا نبیل بھوپی! وہ علی جہانگیر ہیں۔ وہ رات میں سے مجھے اپنے گھر لے گئے تھے۔"

نبیل اس کی پہلی بات پر متوجہ ہوئے تھے اور دوسری بات پر ان کی پیشانی پر لکیریں نمودار ہوگئی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر وہ نہ صرف خائف ہوگئی بلکہ اپنی حماقت کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا کہ اب اپنے ہاتھ زخمی ہونے کا کیا جواز پیش کرے۔

"پھر کیا کہا اس نے؟" نبیل نے اس کی مشکل کم کر کے بات آگے بڑھائی۔

"اپنی صفائی پیش کر رہے تھے اور یہ کہ مجھے ان کا اعتبار کرنا چاہیے وہ میرے ساتھ مخلص ہیں۔" وہ سر جھکائے رک رک کر بول رہی تھی۔

"تم نے کر لیا اس کا اعتبار؟" نبیل کا لہجہ سادہ تھا لیکن نظریں بے حد چبھتی ہوئیں۔ جو اسے اپنا وجود چھیدتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"نہیں۔ جب میرا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تو پھر میرے اعتبار کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ہاں تمہارا کیا تعلق، تم نے تو صرف نکاح نامے پر دستخط کیے ہیں۔ باقی کام دوسرے کریں گے۔" نبیل اس کی بات پر چپ کر بولے تو وہ گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"کوئی مطلب نہیں۔ چلو جاؤ بوا کے ساتھ کھانا لگواؤ۔ پھوپھو آنے والی ہوں گی۔" نبیل اس وقت اس کے ساتھ مزید مغز ماری نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ڈانٹ کر اٹھا دیا۔

"ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟ ایک تو میں نے آپ کو سچ بات بتا دی۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"بہت احسان کیا مجھ پر ہوشہ!" نبیل سر جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان سے پہلے کمرے سے نکل آئی۔

پھر کھانا لگنے تک آسیہ بھی آ گئی تھی اور نبیل پر بیٹھتے ہوئے پہلے اس کے ہاتھ کی بابت پوچھا ساتھ احتیاط کی تاکید بھی کی۔ اس کے بعد نبیل کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"کافی گہرے زخم آئے ہیں اور یہ شکر ہے کہ کوئی نس نہیں کٹی ورنہ بہت خون جاتا۔"

نبیل بس ہوں کر کے رہ گئے جبکہ نظریں اس کے ہاتھ کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"مما کھانا کھائیں نا؟" اس نے اپنی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے آسیہ کو مخاطب کر کے سالن کا ڈونگا اس کے سامنے کھسکا دیا اور یوں اپنی پلیٹ پر جھک گئی جیسے بہت بھوک لگی ہو۔ اصل میں نبیل کی نظروں سے خائف ہو رہی تھی اور یہ دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ کہیں بے خیالی میں ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے اور بے خیالی میں تو نبیل بہت سوچ کر وہ آسیہ کو متوجہ کرنے لگے۔

"پھوپھو! کل سے صبا کالج نہیں جائے گی۔"

"ہاں بیٹا! جب تک اس کا ہاتھ۔" آسیہ جو بھی اس کے مطابق اسی قدر سمجھا تھا کہ وہ بول پڑے۔

"میں ماتحتی ہو رہے تھے نہیں ہوں، بالکل چھوٹا ہاتھ تو انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پھر؟" آسیہ کھانے سے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"پھر یہ کہ جب تک شاہ پور والوں کے ساتھ کوئی معاملہ طے نہیں ہو جاتا یا کوئی فیصلہ تب تک صبا کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا کوئی بھروسا نہیں کسی دن راستے میں سے اسے بھی لے گئے تو ہم۔"

نبیل قصداً بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ جانے آسیہ کیا جواب دیتی ہے۔

"ہوں۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" آسیہ خاصی تاخیر سے پرسوچ انداز میں بولی تھی۔ "شاہ پور والے بہت اونچے شملے والے لوگ ہیں اور میں اب تک خاموش اس لیے ہوں کہ وہ خود اپنے باپ کے پاس جانے کا بہت شوق تھا۔ اس کا شوق پورا ہو جائے پھر میں دیکھتی ہوں وہ کیسے وہاں رہتی ہے اور صبا کو بھیجنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس نے بے اختیار سر اٹھا کر آسیہ کو دیکھا تھا پھر فوراً وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ تو کچھ دیر تک خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات کو محسوس کر رہی ہے۔ آسیہ نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی اور اب تک تو وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔ بلکہ نبیل سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر آسیہ نے اس کی رخصتی کا سوچا تو وہ زہر کھا لے گی پھر اب اچانک اس بات سے اس کا دل کیوں بے چین ہو گیا تھا۔

کتنی دیر تک وہ ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی۔ لیکن دل کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اسے نبیل پر غصہ آنے لگا کہ انہوں نے اس کے کان میں جانے کی بات کیوں کی۔ علی جہانگیر کو اگر اسے لے جانا ہوتا تو آج ہی شاہ پور لے جاتا۔ وہ تو محض مجھے۔

"اف! یہ میں کیا سوچنے لگی؟" یکلخت سے احساس ہونے پر وہ خود کو سرزنش کرنے لگی۔

"علی جہانگیر کا اعتبار کر کے کیا میں مما سے لڑ سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں اور وہ شاید یہی چاہتا ہے اور میں کیا کروں اس کا اعتبار کر بھی لوں تب بھی مما کو تو دکھ نہیں دے سکتی۔" وہ بہت دکھ سے سوچ رہی تھی۔

❁ — ❁ — ❁

وہ کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی تھی اور باؤنڈری وال سے آگے دور تک پھیلے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تنگ سی سڑک کو دیکھنے لگی جو جانے کہاں تک جاتی تھی۔ کھیتوں کی حد ختم ہونے کے بعد یقیناً کسی سمت مڑتی ہوگی۔ وہ اس سمت کے بارے میں غور کرنے لگی۔ کیونکہ رات اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی دن موقع پا کر وہ بہت خاموشی سے یہاں سے نکل جائے گی اور اس کے لیے اسے راستوں سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔

"لیکن کس طرح میں گھر ایسی آگئی جاؤں۔" وہ الجھتی ہوئی سوچ رہی تھی تب ہی کمرے میں آہٹ ہونے سے وہ ایک دم چونکی۔ پھر کھڑکی سے اندر جھانکا اور مہراں کو دیکھ کر مطمئن سی ہو کر کمرے میں آتے ہوئے پوچھا

"کیا بات ہے؟"

"صفائی کرنی ہے جی۔" مہراں ہاتھ میں بڑا سا کپڑا لیے اس کی اجازت کی منتظر تھی۔

"ہاں تو کرو۔" وہ بے نیازی سے صوفے پر جا بیٹھی اور اسے ایک ایک چیز کو رگڑتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اچانک ایک خیال کے تحت اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

''سنو میراں تم کہاں رہتی ہو؟''

''ادرائی'' (ادھر ہی) میراں کے جواب سے وہ جھنجھلا گئی۔

''میرا مطلب ہے تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''وہ پیچھے جو نوکروں کے گھر ہیں اور۔'' میراں نے سیدھا سادا جواب دیا۔

''کب سے ہو یہاں۔ اس سے پہلے کہاں تھیں؟''

''کہیں نہیں میں تو جی پیدا ہی ادر ہوئی۔ میری ماں بھی۔''

''اور تمہاری نانی بھی اور تمہاری دادی بھی سب ادھر ہی پیدا ہوئیں۔'' وہ سخت مایوس ہو کر بولنے لگی تھی۔
میراں خائف سی ہو گئی۔

''اچھا سنو تم کبھی شاہ پور سے باہر بھی گئی ہو۔ میرا مطلب ہے اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں۔'' اس بار اس نے مایوسی ہی کے عالم میں پوچھا تھا جیسے ابھی بھی جواب نفی میں آئے گا۔

''ہاں جی، بی بی جی۔ ایک بار ابا مجھے چاچا کے گھر لے گیا تھا۔'' میراں نے اس کی توقع کے خلاف جواب دے کر اسے خوش کر دیا۔

''کہاں' تمہارا چاچا کہاں رہتا ہے؟''

''کوٹری۔''

''کوٹری۔'' اس نے سوچتے ہوئے انداز میں دہرایا پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ''کیسے گئی تھیں۔ ٹرین میں؟''

''نہیں جی۔ بس میں' بہت مزہ آیا تھا۔''

''ضرور آیا ہوگا یہ بتاؤ بس کہاں سے جاتی ہے؟'' وہ فوراً اپنے مطلب پر آ گئی۔

''پتا نہیں جی۔ مجھے تو ابا لے گیا تھا۔'' میراں نے اس بار لاعلمی کا اظہار بہت مسکین سی شکل بنا کر کیا۔ تو وہ دانت پیس کر بولی۔

''الو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''وہ جی صفائی۔''

''کوئی صفائی وفائی نہیں کرنی۔'' وہ غصے سے کھڑی ہوئی تو میراں نے بھاگ جانے ہی میں عافیت جانی۔

''بڑی آئی صفائی کرنے والی ہونہہ اور یہ میں کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہوں؟ جب جانا ہوگا چلی جاؤں گی۔ کوئی روک سکتا ہے مجھے روک کر تو دکھائے کوئی۔ میں صبا نہیں ہوں جو رعب میں آ جاؤں گی۔ میں تو چیخ چیخ کر ساری حویلی سر پر اٹھا لوں گی۔ ڈرتی نہیں ہوں میں کسی سے۔''

وہ غصے سے ٹہلتی ہوئی ادھر سے ادھر ٹہلنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ بولے جا رہی تھی۔

''پاپا آ جائیں۔ لیکن نہیں وہ تو بابا جان کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکتے' خود بات کرتی ہوں۔ ابھی اسی وقت۔ صاف کہہ دوں گی کہ اب میرا یہاں دل نہیں لگتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔'' وہ ایکدم سے فیصلہ کر کے اسی وقت دوپٹا اٹھا کر شانوں پر پھیلاتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج میں بی بی جان بڑی بہو کے ساتھ جانے کس مسئلے پر بات کر رہی تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے [illegible] اسے پاس بلایا لیکن اس نے فاصلے پر ہی رک کر عجلت میں پوچھا۔

''بابا جان کے پاس کوئی مہمان تو نہیں ہے۔''

''نہیں۔ لیکن شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔'' بی بی جان نے کہا۔

''ابھی گئے تو نہیں نا۔'' وہ اسی عجلت میں کہتی ہوئی تیز قدموں سے چل پڑی اور بابا جان کے کمرے کے پاس رک کر پہلے دستک دی۔ اور ان کا جواب آنے پر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''السلام علیکم بابا جان!''

''جیتی رہو۔'' بابا جان نے اونچا شملہ اپنے سر پر جماتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ خاصی بے نیازی سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہوں۔'' جواب میں انہوں ہنکارا بھرا، وہ بھی بادل نخواستہ کیونکہ انہیں اپنے معمولات سے متعلق سوال بالکل پسند نہیں تھے نہ کسی کو اجازت تھی اور وہ ان کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود بے ساختہ بولی۔

''میں بھی جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟'' بابا جان کا اپنی اسٹک کی طرف بڑھتا' ہاتھ رک گیا۔

''کراچی' ایک دو دن مما کے پاس رہوں گی پھر اسلام آباد چلی جاؤں گی کیونکہ میرے کالج کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ آپ کسی سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔'' وہ بظاہر بڑے آرام سے کہتی ہوئی صوفے میں دھنس گئی۔

''یہ اچانک تم نے جانے کا پروگرام کیسے بنا لیا؟'' وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

''میرے پروگرام ایسے اچانک ہی بنتے ہیں۔'' وہ بول کر خود ہی ہنسی۔ ''حالانکہ اس روز پاپا نے بہت اصرار کیا تھا کہ میں ان کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں بنا اور اب میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔''

''سکندر سے ملے بغیر؟''

''تو میں کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آ جاؤں گی۔'' وہ بھی ان کی اولاد تھی۔ کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے کتنی خائف ہے۔

''وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ جب تک سکندر نہ آ جائے اور ہم اس کی اجازت کے بغیر تمہیں کسی کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔'' بابا جان نے اسے ٹالنے کی سعی کی تو وہ حیران ہو کر بولی۔

''آپ کو پاپا سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟''

''کیوں نہیں وہ تمہارا باپ ہے۔ ہم سے کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہیں کیوں جانے دیا اور تمہیں جلدی کیا ہے۔ کل شام تک سکندر آ جائے گا تب۔''

''اف نہیں۔ کل شام تو بہت دور ہے۔ میں ابھی جاؤں گی' آپ پاپا سے فون پر بات کر لیں وہ منع نہیں کریں گے۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

بابا جان کچھ دیر تک پرسوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔ پھر فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے ہم سکندر سے بات کرتے ہیں۔ تم جب تک تیار ہو کر آؤ۔ ہم خود تمہیں لے کر جائیں گے اور سنو جاتے ہوئے کسی سے کہو تیمور کو ہمارے پاس بھیج دے۔''

''جی بہتر۔'' وہ بمشکل اپنی حیرت اور خوشی چھپا سکی اور فوراً ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اتفاق سے شاہ تیمور اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ بڑی عجلت میں اسے بابا جان کا پیغام دے کر اوپر چلی آئی۔ کسی خاص تیاری کی ضرورت

نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر جانا چاہتی تھی۔ اس کی سب بول لیے۔ تب ... سے گئی تو جانے کیا خیال آیا کہ پہلے مہر النساء کے پاس چلی آئی اور اسے مخاطب کر کے بولی۔

''آنٹی! میں جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟'' مہر النساء نے یونہی پوچھ لیا ورنہ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''کراچی اپنی ماما کے پاس۔ پاپا آئیں تو ان سے کہیے گا میں انھیں فون کرتی رہوں گی۔''

مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی اور پھر آ کر بی بی جان کو اپنے جانے کا بتا رہی تھی کہ شاہ تیمور آ گیا۔

''چلو کزن! بابا جان انتظار کر رہے ہیں۔''

''اچھا بی بی جان! میں پھر آؤں گی۔'' وہ کہتی ہوئی بی بی جان کے گلے لگ گئی۔

''تمہارا اپنا گھر ہے۔'' بی بی جان نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ ان کے گال پر پیار کر کے شاہ تیمور کے پیچھے باہر نکل آئی۔

بابا جان گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور اس کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئی تو شاہ تیمور نے دروازہ بند کیا پھر دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

کچھ دیر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر بابا جان اور شاہ تیمور آپس میں کسی زمینی جھگڑے کے بارے میں باتیں کرنے لگے تو اس نے آرام سے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا اور اس خیال میں کھو گئی کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو سب لوگ اس سے کس طرح ملیں گے اور کیسے کیسے سوال کریں گے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طویل مدت کے بعد گھر جا رہی ہو۔ دل چاہ رہا تھا بس فوراً پہنچ جائے۔ پتا نہیں کتنی دیر کا سفر تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی ایک ریسٹ ہاؤس کے سامنے رکی تو اپنے خیال سے چونک کر وہ نا سمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

بابا جان جواب دیے بغیر اتر گئے اور شاہ تیمور آ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''بابا جان کو یہاں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ تب تک چلو میں تمھیں یہاں کی سیر کرا دوں۔ بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ تمھیں ہمیشہ یاد رہے گا۔''

''کتنی دیر لگے گی؟'' اس نے اترتے ہوئے پوچھا۔

''ایک یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے۔'' شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک ادھیڑ عمر آدمی بھاگتا ہوا آ گیا۔

''جی سائیں سلام بڑے سائیں۔''

''اپنی گھر والی سے کہو ہماری پوتی کے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کرے اور ذرا جلدی کیونکہ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔'' بابا جان نے چوکیدار سے کہا پھر اسے دیکھ کر بولے۔

''بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔''

''جی!'' وہ بس اتنا کہہ سکی۔

''تیمور! تم پہلے اسے ریسٹ ہاؤس کی سیر کراؤ۔'' بابا جان کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ ان کے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''بابا جان کہاں جا رہے ہیں؟''

''وہ ادھر جہاں لوگ جمع ہیں۔ وہ سب بابا جان کا انتظار کر رہے ہیں چلو ہم اندر چلتے ہیں۔''

اس نے بابا جان کی طرف سے دھیان ہٹا کر شاہ تیمور کو دیکھا پھر اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''یہاں کوئی رہتا بھی ہے؟''

''چوکیدار' اس کی بیوی اور بچے' ہم لوگ اکثر پکنک وغیرہ کے لیے یہیں آتے ہیں۔ ویسے یہ سارا علاقہ سکندر چچا کی ملکیت ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی انھوں نے ہی بنوایا تھا۔''

وہ اپنے تئیں اسے بڑی مفید معلومات فراہم کر رہا تھا اور اس انداز سے جیسے وہ بڑی مشتاق ہوگی اور وہ ضرور ہوتی اگر جو اس روز بابا جان کی باتیں نہ سن چکی ہوتی جو وہ کہہ رہے تھے۔

''اس سے کہو اگر مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہے تو صباحت کو ہمارے حوالے کرے۔''

اس کے بعد اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ابھی بھی بہت بے دلی سے سن رہی تھی۔

''تم شاید تھک گئی ہو۔'' اس کی خاموشی محسوس کر کے آخر وہ ٹوک گیا۔

''بابا جان کب تک فارغ ہو جائیں گے؟'' وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔

''یا اللہ! تم تو بہت ہی بور لڑکی ہو۔ میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تم بیٹھو یہاں میں بابا جان کو لے کر آتا ہوں اور کھانے کا بھی پتا کرتا ہوں۔ اگر تیار ہو تو ٹھیک ورنہ کراچی جا کر کھائیں گے۔'' وہ اس کی بیزاری پر جھنجھلا گیا تھا۔

''میں بھی چلتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ بابا جان یہیں آئیں گے۔'' وہ قدرے غصے سے کہہ کر زینے اتر گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے پیچھے دیکھتی رہی پھر ٹیرس پر نکل آئی دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اسے پہلی بار اس منظر میں کشش نظر آئی تو کچھ دیر کو اس کا دھیان بٹ گیا۔

''یہ سب میرے باپ کی جاگیر ہے۔ کتنے بڑے آدمی ہیں پاپا۔ کتنے امیر' کوئی کمی نہیں۔ چاہ لیا دس بیویاں افورڈ کر سکتے ہیں پھر انھوں نے ماما کو کیوں چھوڑ دیا۔ بے شک انھیں شاہ پور لے کر نہ آتے۔ کہیں اور رکھ سکتے تھے اور ان کے بارے میں بابا جان کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ماما کو ساتھ لے کر یہ ملک ہی چھوڑ جاتے تو کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا ان کا لیکن شاید۔''

اس کی سوچیں جانے کس سمت بہہ نکلی تھیں کہ عقب سے چوکیدار کی بیوی اسے پکار کر بولی۔

''بی بی! کھانا کھا لیں۔''

''جی'' وہ چونک کر پوری اس کی طرف گھوم گئی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کھانا تیار ہے نیچے آ جائیں۔''

''چلو۔'' وہ ایک طرح سے انتظار ختم ہونے پر شکر کرتی ہوئی نیچے آئی تو ملحقہ روم میں ہی ٹیبل پر کھانا لگا تھا۔ اس نے ہاتھ دھونے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو ایک دم سے بابا جان اور شاہ تیمور کا خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

''وہ جان کہاں ہیں؟''

"بڑے سائیں! وہ تو جی چلے گئے۔" عورت کے جواب سے وہ قدرے ٹھٹک گئی۔

"کہاں۔ کہاں چلے گئے اور وہ تیمور؟"

"پتا نہیں جی! بڑے سائیں اور تیمور سائیں دونوں چلے گئے۔ میرے آدمی سے کہہ گئے ہیں، آپ کا خیال رکھے۔ آپ ادھر ہی رہیں گی۔" عورت اپنے سادہ سے انداز میں بتا رہی تھی۔

"نہیں۔" اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا اور پھر اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن آگے گیٹ پر موجود چوکیدار نے اسے روک لیا تھا۔

"بڑے سائیں کا حکم ہے جب تک وہ نہ کہیں آپ اور سے نہیں جا سکتا۔"

❁ ❁ ❁

"وہ مدحو کا فون تو نہیں آیا؟" آسیہ نے جاتے جاتے رک کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تو صباحت اور نبیل چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"نہیں مما!" نبیل کے اشارے پر صباحت نے جواب دیا تھا۔ "کئی دنوں سے اس نے فون نہیں کیا۔ غالباً ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔"

"بہت دل لگ گیا ہے اس کا وہاں۔ نالائق لڑکی کو اپنی پڑھائی کی بھی فکر نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گی؟" آسیہ نے تاسف بھرے انداز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"پھوپھو! اگر آپ اجازت دیں تو میں فون کروں مدحو کو۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کیلئے۔" نبیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولی۔

"نہیں! یہاں سے کوئی فون نہیں کرے گا۔"

"کیوں پھوپھو! آپ مدحو سے کیوں بدگمان ہو رہی ہیں۔ وہ خود سے تو نہیں گئی۔"

"میں اس سے بدگمان نہیں ہوں۔" اسے نبیل کا ٹوکنا اچھا نہیں لگا تو ناگواری چھپا کر بولی تھی۔

"پھر آپ نے اسے اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کی مرضی پر! کیا وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ نہیں پھوپھو ابھی وہ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والی عمر سے نہیں نکلی۔ ابھی قدم قدم پر اسے راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ شاہ پور والے اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیں، آپ کو اسے وہاں سے لانے کی تگ و دو کرنی چاہیے۔" نبیل نے دھیرج سے اسے مدحیہ کو احساس دلانے کی سعی کی تو وہ اندر ہی اندر جزبز ہو کر بولی۔

"میں کیا کروں جب وہ آنا ہی نہیں چاہتی۔ ایسے میں ہماری کوشش کس کام کی؟ الٹا ہمیں منہ کی کھانی پڑے گی۔ جب وہ یہ کہہ دے گی کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں اپنے باپ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کہے گی۔" نبیل نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

آسیہ دکھ سے مسکرائی اور گہری سانس لے کے اندر روک کر کہنے لگی۔

"بہرحال۔ اب مدحو کا فون آئے تو تم اس سے پوچھ لینا کہ وہ کیا چاہتی ہے اگر یہاں آنے پر آمادہ ہے تو پھر۔"

"نبیل بھائی جا کر اسے لے آئیں گے۔" صباحت درمیان میں بول پڑی۔ پھر کچھ خائف بھی ہو گئی تو اسے ٹوکنے کا خیال چھوڑ کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے اور ہاں آج شام کو واپسی میں بھی دیر ہو جائے گی تم دونوں کھانا کھا لینا۔"

"نہیں مما! ہم آپ کا انتظار کریں گے، آپ خواہ گیارہ بجے آئیں۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے کیوں نبیل بھائی؟" صباحت نے کہہ کر نبیل کا بازو تھام لیا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر ابھی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھا لینا۔" وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"میں اتنی کمزور کبھی نہیں تھی۔ مجھے مدحو نے کمزور کر دیا ہے۔"

گاڑی گیٹ سے نکالتے ہی اسے پھر مدحیہ کا خیال آ گیا تھا اور حقیقتاً وہ اس کے لیے بہت پریشان تھی اور بے بس بھی۔ اس لیے اسٹینڈ نہیں لے رہی تھی ورنہ اگر مدحیہ اس کے پاس آنے پر آمادگی ظاہر کرتی تو وہ یوں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور صباحت کے معاملے میں بھی وہ محض مدحیہ کی وجہ سے چپ تھی اور چاہتی تھی کہ پہل شاہ پور والوں کی طرف سے ہو۔ جنہوں نے اب تک صباحت کے حصول کے لیے جانے کیوں پیش رفت نہیں کی تھی اور اسے کیونکہ رتی برابر بھی کوئی ایسی امید نہیں تھی اس لیے جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا اور ابھی یہ جان کر کہ مدحیہ نے ایک ہفتے سے فون نہیں کیا اور تشویش بھی ہو گئی تھی گو کہ خود اس نے ایک بار بھی مدحیہ کا فون نہیں سنا تھا پھر بھی اطمینان تھا جو کہ اب اچانک رخصت ہو گیا تھا۔ سارا وقت مریضوں کو اٹینڈ کرنے کے دوران بھی بار بار ہمیشہ کی طرح اسے غیر ذمہ داری اور موڈی کہہ کر خود کو بہلا بھی نہیں پا رہی تھی۔

تقریباً دس بجے وہ ایک ڈیلیوری کیس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو بہت تھک گئی تھی۔ زیادہ ذہنی انتشار نے تھکا دیا تھا۔ جبھی وہ فوراً گھر جانے کی بجائے اپنے اعصاب پرسکون کرنے کی خاطر ہاتھ منہ دھو کر وہیں بیٹھ گئی اور مائی کو بلا کر چائے لانے کا کہا تو وہ اس کے سامنے ٹیبل سے ایک کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بی بی! ایک آدمی بہت دیر سے بیٹھا ہے۔"

"کون ہے؟" اس نے کارڈ لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس کے اعصاب مزید تن گئے۔ پیشانی پر ایک ساتھ کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"کیا بھیجوں جی اس سے؟" مائی پوچھ رہی تھی۔

اس نے چونک کر مائی کو دیکھا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی تھی۔

"بھیج دو اور سنو چائے ابھی مت لانا۔"

"جی اچھا!" مائی چلی گئی تو وہ ایک نظر اپنا جائزہ لے کر سیدھی ہو بیٹھی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر پین اٹھا کر پیڈ پر چلانے لگی۔

اگلے پل شاہ جہانگیر حیات دروازے میں نمودار ہو کر بولے۔

"السلام علیکم۔"

وہ سر اونچا کر کے براہ راست انہیں دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔

"اندر آ سکتا ہوں۔" شاہ جہانگیر نے ہلکے سے دروازہ بجا کر اپنے تئیں اسے چونکانا چاہا لیکن وہ بڑے آرام سے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"تشریف لائیے۔"

"شکریہ۔" شاہ جہانگیر آ کر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پہلے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر ایک طرح سے جتایا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے پھر انہیں دیکھ کر بولی۔

"فرمایئے۔ کیسے زحمت کی؟"

"میں صباحت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں کیا سوچا ہے آپ نے؟" شاہ جہانگیر نے اس کا تیور دیکھتے ہوئے تمہید کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ اندر تک سلگ گئی تھی۔ دل چاہا اس شخص کو بری طرح بے عزت کر کے نکال باہر کرے۔ لیکن مدیحہ کا خیال تھا جو اسے بہت ضبط کرنا پڑا پھر بھی جب بولی تو لہجے میں غصہ تھا۔

"آپ کو صباحت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس بات سے سروکار کہ میں اس کے لیے کیا سوچتی ہوں؟"

"آپ شاید بھول رہی ہیں کہ وہ میرے بیٹے علی کی منکوحہ ہے۔" انہوں نے فاتحانہ انداز میں جتایا تو وہ بھی تنفر سے بولی۔

"جی نہیں، میں کچھ نہیں بھولی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار پہلے بھی آپ میرے باپ کے دروازے پر آئے تھے۔"

"میں گزری باتیں دہرانے نہیں آیا۔" وہ فوراً بولے تھے۔ "مجھے صرف صباحت کی رخصتی طے کرنی ہے۔"

"بس کریں شاہ جہانگیر حیات! اتنے نادان نہیں ہیں آپ جو یہ جواب نہ جانتے ہوں۔ انسان ایک بار دھوکا کھاتا ہے اور وہ بھی انجانے میں' مجھے آپ اور اب آپ جا سکتے ہیں۔" وہ اب مزید ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں جانے کا کہہ کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تو شاہ جہانگیر اس کی تقلید کرتے ہوئے بولے۔

"آپ غلطی کر رہی ہیں ڈاکٹر آسیہ۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگ گئی اور گو کہ شاہ جہانگیر بھی اس کی طرف سے عزت افزائی کی امید لے کر نہیں آئے تھے پھر اس کا رویہ انتہائی ہتک آمیز لگا بمشکل خود پر ضبط کرنے کے بعد بولے تھے۔

"میرا خیال ہے اس وقت آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اس لیے میری بات سمجھ نہیں پا رہیں۔ گھر جا کر آرام سے سوچئے گا اور کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ مدیحہ آپ کے قبضے میں ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ایک دم ٹھٹکی تھی۔

"مدیحہ کی سلامتی کے لیے۔"

"شٹ اپ جہانگیر حیات!" وہ کس طرح خود پر قابو نہیں پا سکی۔ "آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ [illegible]"

شاہ جہانگیر کے چند لمحے [illegible] ان کے جانے کے بعد [illegible] دونوں ہاتھوں [illegible] اور دونوں ہاتھوں [illegible] محسوس ہو رہی تھی۔

[illegible] پریشان ہوگی۔

"کیا ہوا میڈم؟"

اس نے آواز سن کر بھی کوئی حرکت نہیں کی تو سسٹر جلدی سے جا کر گلوکوز بنا کر لے آئی اور اپنے ہاتھ سے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

چند گھونٹ لے کر اس نے اپنا سر چیئر کی بیک پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔

سسٹر نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر اس سے بولی۔

"میڈم! آپ کے گھر سے فون ہے۔"

وہ بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر سسٹر کو دیکھا اور آہستہ آواز میں بولی۔

"کہہ دو میں فارغ نہیں ہوں۔"

سسٹر نے اس کی بات دہرا کر فون بند کر دیا تو اس نے اسے جانے کا اشارہ کر کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ لیکن تنہائی کہاں تھی۔ بند پلکوں کے اندر ایک فلم سے چلنے لگی تھی۔ جس میں تسلسل نہیں تھا۔ ماضی و حال کے واقعات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایسے ہی چہرے اور آوازیں تھیں۔

"اطمینان رکھیں۔ کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا، اچھا ہی چاہوں گا۔"

شاہ سکندر نے کہا تھا اور ان کا اعتبار کر کے ہی اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو اسے خود اپنے ہاتھوں سے سولی چڑھانا تھا اور وہ کس کی طرف سے دل پر پتھر رکھے۔

"مدحو، صبا۔"

"صبا، مدحو۔"

بالکل غیر ارادی طور پر وہ انتخاب کرنے لگی تھی کہ ایک دم گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جیسے بھیانک خواب سے جاگی ہو۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی کے ساتھ ہتھیلیاں بھی پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔

"میرے خدا!" اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر رگڑا پھر انگلیاں بالوں میں پھنسا کر سر کو زور زور سے جھٹکے دے کر ایک طرح سے ساری سوچوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی اور کسی حد تک کامیابی ہوئی تو فوراً گھر کا خیال آیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ گھڑی دیکھتے ہی وہ گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ کبھی اس طرح اور اتنا نہیں روئی تھی۔ نہ کبھی کہیں شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے برعکس ذرا سی زیادتی پر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی اور جب تک اپنی منوا نہیں لیتی تھی سکون سے نہیں سوتی تھی۔ لیکن یہاں کون تھا اس کی سننے والا۔ اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار، اس کی بیوی اور دو بچے جن پر چیخ چلا کر اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ بابا جان کے حکم کے غلام تھے اور ان بے بسوں سے بھی بڑھ کر اس پر بے بسی طاری ہوئی تھی جس نے اسے اتنا رلایا تھا۔ دوپہر سے شام ہو گئی اور پھر تاریکی کے ساتھ ساتھ خوفناک سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ وہ جس کمرے میں بیٹھی تھی اس کی کھلی کھڑکیوں سے دور تک کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے، دور تک پھیلا سبزہ دن کے اجالے میں جتنا دلکش تھا اب اتنا ہی خوفناک۔ اس نے چاہا کہ اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دے لیکن ہمت ہی نہیں ہوئی تو سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد جنریٹر آن ہونے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی محسوس ہوئی تب ہی اس نے ڈرتے ڈرتے سر

اونچا کیا اور چوکیدار کی بیوی کو دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی تو پوچھنے لگی۔

"کوئی آیا ہے؟"

"نہیں بی بی! اس وقت کون آئے گا۔ آپ یہ کھانا کھالو۔ دوپہر میں بھی نہیں کھایا۔" چوکیدارنی نے ٹرے اس کے سامنے رکھی پھر نیچے بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ روتی کیوں ہو؟ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے ان سنی کر کے پوچھا۔

"یہ سکندر سائیں کی جاگیر ہے۔ آپ پہلے کبھی اور نہیں آئیں؟" اس نے بتا کر پوچھا۔

"نہیں' پاپا آتے ہیں یہاں؟"

"کون؟" وہ سمجھی نہیں۔

"پاپا! شاہ سکندر جن کی یہ جاگیر ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں؟" اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔

"میں تو جب سے یہاں ہوں نہیں آئے اس سے پہلے پتا نہیں۔ آپ بی بی کھانا بھی کھاؤ نا۔" چوکیدارنی نے ٹرے کو مزید اس کے سامنے کھسکایا تو اس نے پانی کا گلاس اٹھالیا اور ایک گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔

"تم کب سے یہاں ہو اب یہ مت کہہ دینا کہ پیدا ہی یہیں ہوئی تھیں۔"

"نہیں جی۔ شادی ہو کر آئی۔ اس سے پہلے بڑے سائیں کی حویلی میں تھی۔ بڑی چوہدرانی کی بڑی خدمت کی ہے میں نے اور میری ماں وہ تو ابھی بھی ادھر ہی ہے۔"

"اچھا کون ہے تمہاری ماں؟" اس نے گلاس رکھ کر کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ اصل میں وہ اس کے چلے جانے سے خائف تھی' اس لیے بات کو طول دے رہی تھی۔

"جیراں۔"

"پھر تو صبا اں تمہاری بہن ہوئی۔"

"ہاں جی۔ آپ کو کیسے پتا؟" چوکیدارنی اسے یوں دیکھنے لگی۔ جیسے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں وہیں سے آرہی ہوں۔"

"ہیں جی۔ میں نے تو آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔"

"مائی گاڈ!" وہ اکتا گئی۔ "تم کوئی اور بات نہیں کر سکتیں۔"

"اور کیا بات کروں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ' بابا جان دوبارہ کب آنے کو کہہ گئے ہیں؟" اس نے فوراً اسے مشکل سے نکالا۔

"پتا نہیں جی۔ میرے آدمی کو پتا ہوگا' پوچھ کر آؤں؟" وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

"نہیں' صبح میں خود معلوم کروں گی اور سنو۔ تم یہیں میرے پاس سونا۔ بے شک اپنے دونوں بچوں کو لے آؤ۔"

"اپنے آدمی سے پوچھتی ہوں۔ وہ کہے گا تو آجاؤں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے سے ٹرے اٹھا کر چلی گئی تو اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سوچا۔

"کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں؟ کوئی حکمرانی کے نشے میں چور ہو کر بھی خوش نہیں اور کوئی غلامی میں بھی خوش۔"

کھانے کے بعد بدن میں کچھ توانائی آگئی تھی اور ذہن بھی سوچنے کے قابل ہو گیا تھا البتہ اندر خوف جوں کا توں موجود تھا۔ جب ہی چوکیدارنی کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی اور وہ کوئی پندرہ منٹ کے بعد آئی تھی۔ اپنے ایک بچے کو سینے سے لگائے ہوئے۔ اس کے بیڈ کے برابر نیچے گدا بچھا کر بچے کو سلایا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ تو وہ جو یہ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھ رہی تھی فوراً پوچھنے لگی۔

"تم سو رہی ہو؟"

"نہیں جی۔ مجھے پتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ جب تک آپ سو نہیں جاؤ گی' میں نہیں سوتی۔" اس نے لمبی جماہی لے کر کہا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔ تم سو جاؤ آرام سے۔"

"ہیں جی۔"

"ہاں جی۔" اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ چیخ کر بولی پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

چوکیدارنی نے چپ سادھ لی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی تھی۔ اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی، لیکن نیند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آکر لیٹی اور کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں آسمان کے سینے پر جگمگاتے ستاروں میں بھٹکنے لگیں۔ جبکہ ذہن کے دریچوں پر ایسی ہی ننھی ننھی قندیلیں جلتے بجھنے لگی تھیں۔

وہ دن جو لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ سب کی محبتوں کے ساتھ اسے اس کے متلی رویوں کی چبھ دکھلا رہے تھے۔

اس کا قصداً الماری زور سے بند کرنا کہ ادھر نبیل بھائی اپنے کمرے میں اچھل پڑتے۔

صبا پر خواہ مخواہ کا رعب جمانا۔

اور جو کبھی مما ڈانٹ دیتیں تو وہ فوراً شاکی ہو کر دھمکی دیتی۔

میں اپنے باپ کے پاس چلی جاؤں گی۔

کس قدر خائف کر دیتی تھی وہ اپنے ایک جملے سب کو خصوصاً صبا تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑتی تھی۔

"خدا کے لیے مدحا تم شاہ سکندر کا خیال چھوڑ دو۔"

"کیوں' کیوں چھوڑ دوں۔ میرا باپ ہے وہ کتنا زعم تھا اسے جونیل کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جو وہ جب بھی انہیں موقع ملتا اسے اور صبا کو احساس دلاتے تھے کہ ان دونوں کو صرف اپنی مما کا خیال کرنا چاہیے جنہوں نے ان کی خاطر اپنی زندگی تیاگ دی اور یہی سچ تھا لیکن اس کے اندر تو جیسے احساس نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ انا ضد باندھ لیتی۔

پھر اس نے باہر شادی کیا کی، اس کے دل میں ہر ایک کے خلاف نفرت بھر گئی تھی۔

اف ایک شخص کا بدلہ میں نے کس کس سے نہیں لیا۔ مامی جی' سونیا آپی بھلا ان کا کیا قصور تھا اور مما کو کتنا تنگ کیا میں نے۔ اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں اور پھر ہر شخص کے ساتھ اپنا رویہ سوچ کر وہ روتی رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

صبح جب سورج کی کرنیں براہِ راست اس کے چہرے پر پڑیں تب وہ اٹھی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ شاہ تیمور کی آواز سن کر رک گئی۔

"بی بی کہاں ہے؟" وہ چوکیدارنی سے اس کا پوچھ رہا تھا۔

"سو رہی ہیں۔"

"شور تو نہیں مچایا تھا اس نے؟"

"نہیں جی، شور تو نہیں مچایا پر روئی بہت تھیں۔" چوکیدارنی کے جواب پر وہ جز بز ہونے لگی۔

"کھانا کھایا تھا؟"

"دوپہر میں تو نہیں، رات میں کھایا تھا۔"

"اچھا، جاؤ اٹھاؤ اسے۔" وہ تحکم سے کہہ رہا تھا۔

وہ جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر دوبارہ واش روم میں بند ہو گئی اور خود کو اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے لگی۔ رات اس نے اس نہج پر نہیں سوچا تھا کہ بابا جان کے اس اقدام پر اسے کیا ردِعمل ظاہر کرنا چاہیے ابھی ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ اسے کمزور نہیں پڑنا اور نہ ہی لڑنا ہے۔ کیونکہ جان گئی تھی کہ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

چوکیدارنی اس کے دروازے پر دستک دے کر جا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی کتنی دیر سوچتی رہی۔ باہر نکل کر آئی تو شاہ تیمور کو دیکھتے ہی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

"ہیلو کزن، کیسے ہو؟"

شاہ تیمور غالباً کچھ اور سوچے بیٹھا تھا جب ہی حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"بابا جان نہیں آئے گا؟" وہ اس کی حیرت سے نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" شاہ تیمور نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا تو وہ بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"میری طبیعت کو کیا ہوا؟"

"شریفاں بتا رہی تھی کل تم روتی رہی ہو۔" وہ اس کے چہرے پر جانے کیا کھوجنے لگا تھا۔

"ہاں، میں بہت روئی۔" وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے چھوڑ کر جو چلے گئے تھے۔ اگر کراچی نہیں لے جانا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ میں نے وہاں جانے کے لیے کوئی اتنی ضد تو نہیں کی تھی جو یوں چھوڑیں۔ یہ بتائیں اب کیا پروگرام ہے؟"

"فی الحال تمہیں یہیں رہنا ہے۔" وہ فوراً کہہ گیا پھر فوراً ہی وضاحت بھی کرنے لگا۔ "میرا مطلب ہے تم وہاں بور ہو گئی تھیں، اس لیے بابا جان نے پروگرام بنایا کہ تمہیں تمام رقبوں کی سیر کرائی جائے تا کہ تم فریش ہو جاؤ۔"

"ہائی بجو! اس کے علاوہ اور کتنے رقبے ہیں۔" وہ متاثر نظر آنے لگی۔

"بہت ہیں۔ تم پہلے ناشتا کرو پھر چلتے ہیں۔" اس نے کہہ کر شریفاں کو پکارا اور اس کے آنے پر مدیحہ کے لیے ناشتا لانے کو کہا تو وہ بول پڑی۔

"چائے ضرور لانا۔ میں نے کل سے چائے نہیں پی۔" پھر آرام سے بیٹھتے ہوئے شاہ تیمور سے بولی۔ "اور کزن کو بھی لے آتے۔"

"لے آؤں گا، کل لے آؤں گا۔" وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اندر کے خوف کے باعث اس نے فوراً پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا، یوں جیسے سمجھ گیا ہو۔

"میرا مطلب ہے، آپ ناشتا نہیں کریں گے؟" اس نے جز بز ہو کر بات بنائی۔

"نہیں، البتہ چائے پی لوں گا۔" وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد شریفاں ناشتا لے آئی تو اس نے پہلے چائے بنا کر ایک کپ اسے تھمایا پھر خود ناشتے میں معروف ہو گئی۔

"سنو، تم کراچی کیوں جانا چاہتی ہو؟" قدرے توقف سے شاہ تیمور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تو وہ سوچ کر کہنے لگی۔

"اصل میں تو مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں میرا کالج ہے۔ کراچی تو بس ایک دو دن رہوں گی۔ کچھ اپنی چیزیں لینی ہیں اور مما سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ صبا کی رخصتی کب کر رہی ہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ اسے رخصت کر دیں گی؟"

"کرنا تو چاہیے۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر رومال سے ہاتھ صاف کرنے لگی پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا اس بات کو اتنا مسئلہ کیوں بنا لیا گیا ہے۔ کیا یہ معاملہ آرام سے بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتا۔"

"بابا جان کی مرضی وہ جیسے بھی طے کریں۔ یہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ چلو۔" وہ موضوع ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہونہہ بابا جان کی مرضی۔" وہ تنفر سے سوچتی اس کے پیچھے باہر نکلی تھی۔

✿—✿—✿

اسے شاہ پور والوں سے کوئی اچھی امید تو نہیں تھی لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ صباحت کے حصول کے لیے وہ مدیحہ کو باقاعدہ یرغمال بنا لیں گے، اور پھر بیٹی کے بدلے بیٹی کی شرط رکھ کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کریں گے۔ وہ مدیحہ کی طرف سے مطمئن تو پہلے بھی نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے جہاں اگر وہ آرام سے نہیں تو تکلیف میں بھی نہیں ہوگی، اس لیے اس نے ابھی تک مدیحہ کی واپسی کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ دوسرے اسے یہ بھی یقین تھا کہ جس روز مدیحہ کا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا، وہ اسی روز واپس آ جائے گی۔ یہ تو اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے وہاں نہیں رہ رہی بلکہ اس کے باپ دادا نے زبردستی اسے روکا ہوا ہے تا کہ اسے چارے کے طور پر استعمال کر سکیں۔ یعنی ان کے نزدیک مدیحہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو ایسی صورت میں وہ صباحت کو وہاں بھیجنے کا کیسے سوچ سکتی تھی؟ وہ بھی اس کی بیٹی تھی۔

شاہ جہانگیر کو تو رات اس نے صاف جواب دے دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے اب تک اسے ایک پل چین نہیں آیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح مدیحہ کو ان کے چنگل سے نکال لائے۔ اس کی سلامتی کے لیے وہ اپنی انا، خودداری، وقار سب داؤ پر لگا سکتی ہے جیسے برسوں پہلے شاہ سکندر کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اسے ایک ام

شاہ سکندر کا خیال آیا تو اس کے اندر دہکتے الاؤ میں شدت آ گئی تھی۔ کاش وہ بھرے مجمعے میں اس شخص کا گریبان پکڑ سکتی۔

"لیکن میں اسے آئینہ تو دکھا سکتی ہوں۔" اس نے کھولتے ہوئے دماغ سے سوچا اور اسی وقت کارڈلیس اٹھا لیا لیکن ان کا کوئی نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ برسوں پہلے جب شاہ پور فون کیا تھا۔ تب بھی ڈائریکٹری میں نمبر دیکھا تھا اور ابھی پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صباحت نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور [illegible] کچھ اندر آئی تھی لیکن اسے ابھی تک بستر میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"مما! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں کیوں؟" اسے اس وقت صباحت کی مداخلت سخت ناگوار گزری تھی۔

"صبح سے کمرے میں جو بند ہیں' اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ کلینک نہیں جانا آپ کو۔" صباحت اس کے کیوں سے قدرے سٹپٹا کر بولی تھی۔

"نہیں' اس وقت نہیں جاؤں گی' سسٹر کا فون آئے تو منع کر دینا۔ کہنا شام میں آؤں گی۔"

"اچھا! میں یہ بتانے آئی تھی کہ میں نیچے اماں جی کے پاس جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔"

"اچھی بات ہے' جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔" وہ سرسری انداز میں کہہ کر اپنے لیے تکیہ ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر سیدھی ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کارڈلیس پر علی جہانگیر کے نمبر پش کرنے لگی۔

"یس' شاہ علی جہانگیر!" تیسری بیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

"میں ڈاکٹر آسیہ بات کر رہی ہوں۔" اس نے خاصے روکھے انداز میں کہا تو ادھر سے وہ فوراً بولا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام کیا تم بتا سکتے ہو کہ شاہ سکندر حیات اس وقت کہاں ہوں گے؟" اس نے مختصر جواب کے ساتھ پوچھا۔

"جی اس وقت کوئٹہ میں ہیں اور شام چھ بجے وہاں سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوں گے۔" اس نے شاہ سکندر کا اگلا پروگرام بھی بتا ڈالا۔

"کوئٹہ کا کوئی نمبر یا موبائل نمبر؟" اس نے سائیڈ کارنر سے پین اور ڈائری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی موبائل نمبر ہے۔" علی جہانگیر نمبر بتا کر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے فوراً شکریہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر خود کو شاہ سکندر سے بات کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد ان کے نمبر ملانے لگی۔

"یس' شاہ سکندر حیات!" بالکل وہی انداز تھا جو اس سے پہلے علی جہانگیر کا تھا۔

"جی میں ڈاکٹر آسیہ۔" اس بار وہ اسی قدر کہہ سکی۔

"کیسی ہیں آپ؟" ان کے لہجے میں یک لخت اشتیاق در آیا تھا اور وہ جو پھٹ پڑنے کو تیار تھی' بمشکل ضبط کر سکی۔

"میرے جواب سے آپ کو مایوسی ہو گی کیونکہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ یکسر ان سنی کر کے پوچھنے لگی۔

"میری بیٹی مدیحہ کہاں ہے؟"

"شاہ پور میں' خیریت۔"

"مجھے مدیحہ کی خیریت مطلوب ہے۔" وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیا کسی نے اس کے بارے میں کچھ کہا آپ سے؟" شاہ سکندر اس بار کچھ ٹھٹکے تھے۔

"آپ کے بھائی شاہ جہانگیر آئے تھے میرے پاس۔ موصوف یہ کہہ گئے ہیں کہ اگر میں مدیحہ کی سلامتی چاہتی ہوں تو صباحت کو ان کے بیٹے کے ساتھ رخصت کر دوں۔" اس نے چبا چبا کر کہا تو دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

"ہیلو' شاہ سکندر حیات! آپ سن لیں۔ اگر میری بیٹی مدیحہ کو کچھ ہوا تو۔"

"نہیں نہیں ڈاکٹر آسیہ! آپ اطمینان رکھیں' اسے کچھ نہیں ہوگا۔" وہ فوراً بولے تھے۔ "کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ جہانگیر بھائی نے جو کچھ کہا' اس کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں' وہ شاید اس صورت حال سے بوکھلا گئے ہیں۔"

"میں یہ سب نہیں جانتی۔ آپ مدیحہ سے کہیں فوراً واپس آ جائے۔ مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش ہونے لگی ہے۔"

"نہیں' تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کی ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔" شاہ سکندر گو کہ شاہ جہانگیر کے اس اقدام پر اندر ہی اندر تلملا رہے تھے' لیکن اسے مسلسل اطمینان دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"جی اور آپ اس کے لیے اچھا سوچیں گے' اچھا کریں گے۔ جیسے صباحت کے لیے۔" اس نے ان کی بات پر سلگ کر طنز کیا۔

"میں اس بات پر بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہیں اور ہاں آپ کو مدیحہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اب میری ذمہ داری ہے اور صباحت پر بھی آپ مکمل اختیار نہیں رکھتیں۔ اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔"

ان کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ جانے اس کا طنز کر برا لگا تھا یا کوئی اور بات یاد آ گئی تھی۔ وہ بہر حال چند لفظ سنانے میں آ گئی پھر ایکدم جیسے ہوش میں آ کر انہیں پکارا لیکن ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

"ہائی فٹ!" اس کا دماغ کھولنے لگا تھا۔ دل چاہا ہر شے تہس نہس کر دے۔

"کیا سمجھتے ہیں شاہ پور والے' میں ان کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ میرا معاملہ تھا جو میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مدیحہ اور صبا کے لیے تو میں زمین آسمان ایک کر دوں گی۔ بڑے آئے حق جتانے والے ان سے پوچھ کر فیصلہ کروں گی ہونہہ۔"

وہ زہر خند سے سوچ رہی تھی اور پھر اسی وقت ایک فیصلہ کر کے ہی اٹھی تھی۔

آسیہ اور نبیل کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ادھر سے ادھر چکراتی رہی' پھر اپنی الماری ٹھیک کرنے کھڑی ہو گئی۔ گو کہ اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن کرنے کو اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ جب سے نبیل نے اس کا کالج جانا بند کروایا تھا اس وقت سے بھی کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور کام بھی کوئی اسے نہیں ہوتے تھے۔ سارا وقت بیکار رہنے سے اس کا ذہن [illegible] ہو رہا تھا۔ کوئی اچھا خیال تو آتا ہی نہیں تھا اور وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا یا اسے لگتا تھا۔ صبح ہوتی

ہے شام ہوتی ہے اور بس' کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ مدیحہ کی طرح چیخ چلا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پھر خوب ہنسے یا خوب روئے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ وہ سب کچھ آسیہ پر چھوڑ کر بھی بے چین سے نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اب علی جہانگیر کا خیال آتا تھا۔ جس کا قصور یہ تھا کہ وہ شاہ جہانگیر کا بیٹا تھا اور یہ قصور کم از کم آسیہ تو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے بہت چاہنے کے باوجود وہ علی جہانگیر کو فون نہیں کر رہی تھی کہ کہیں اس کی محبت میں ہار کر وہ اپنی ماں کو خلوص نہ سمجھنے لگے۔ وہ حقیقتاً اب دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"صبا بیٹا! فون آیا ہے۔" بوا نے اس کے کمرے کے دروازے میں آ کر پکار کر کہا' تو وہ الماری کا پٹ بند کر کے پوچھنے لگی۔

"کس کا ہے؟"

"پتا نہیں کون ہے' پہلے نبیل میاں کا پوچھا میں نے کہا نہیں ہیں تو بولا گھر میں جو بھی ہے بلا دیں۔" بوا تفصیل بتانے کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ درمیان ہی میں نکل کر لابی میں آ گئی اور ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف علی جہانگیر تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

"یار تمہیں ذرا احساس نہیں۔ میں کتنی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

"کیوں کا کیا مطلب؟ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ میری باتوں کو سوچنے کے بعد مجھے فون کرو گی۔" علی جہانگیر نے یاد دلایا تو وہ آزردگی میں گھر کر بولی۔

"مجھے یاد ہے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی باتوں سے اختلاف ہے بلکہ مجھے مما کا خیال ہے اور میں کسی مقام پر بھی ان سے نظریں نہیں چرا سکتی۔" وہ ہنوز آزردہ سی صاف گوئی سے بول رہی تھی۔

"اب میں تم سے کیا کہوں!" وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔

"کچھ نہ کہیں' کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"اچھا سنو۔ تمہیں معلوم ہے۔ آج تمہاری مما نے مجھے فون کیا تھا۔" علی جہانگیر نے اصل میں یہی جاننے کے لیے اس وقت فون کیا تھا۔

"نہیں' کیا کہا انہوں نے آپ سے؟" اس نے لاعلمی کے اظہار کے ساتھ فوراً پوچھا۔

"ہمارے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ سکندر چچا کا پوچھا اور ان کا موبائل نمبر لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم انہوں نے سکندر چچا سے بات کی یا نہیں میں صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن سکندر چچا کا موبائل بند جا رہا ہے۔ اب پتا نہیں تمہاری مما سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بند کیا ہے یا۔"

وہ اس انداز سے بول رہا تھا جیسے اس کا دھیان اس بات کی طرف شاہ سکندر اور آسیہ کے درمیان کیا بات ہوئی ہو گی۔

اور اس کا دھیان آسیہ کی طرف چلا گیا کہ صبح وہ ٹھیک نہیں گئی تھی اور اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔

"ہیلو صبا!" قدرے توقف سے علی جہانگیر نے پکارا تو وہ چونک کر بولی۔

"جی۔"

"تم آج کل کالج نہیں جا رہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہیں میری وجہ سے تو نہیں چھوڑ دیا۔ دیکھو سچ بتانا۔"

وہ خاموش رہی جبکہ اس کے قیاس پر دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"بیوقوف لڑکی! تم کیا سمجھتی ہو میں تمہیں اس گھر سے اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ سب کی موجودگی میں لے جانے کی جرات رکھتا ہوں۔ سمجھیں تم۔"

"میرے خدا!" اس نے گھبرا کر ریسیور رکھ دیا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ یوں جیسے وہ ابھی آ رہا ہو۔ چند لمحوں بعد پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی۔ لیکن وہ نہیں گئی اور جب بوا کو جاتے دیکھا تو انہیں بھی روک دیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہی ہو گا جو اسے اس مقام پر لے آیا تھا کہ وہ کسی معجزے کے رونما ہونے کی دعا کرنے لگی تھی۔ آسیہ کا خوشی سے مان جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔

کتنی دیر وہ وقفے وقفے سے فون کی بیل سنتی رہی پھر جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا جب اس کی باتوں کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن اس بات پر اٹک گیا کہ آسیہ نے شاہ سکندر کو فون کیوں کیا اور کیا بات ہوئی۔ کبھی اسے اپنا خیال آتا کبھی مدیحہ کا اور وہ دونوں میں سے کسی کے متعلق بھی بات کی ہو' اسے بہرحال حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی ماں جو مدیحہ کا فون صرف اس لیے نہیں سنتی تھی کہ وہ شاہ پور سے آتا تھا اس نے خود سے شاہ سکندر کو فون کیسے کر لیا۔ کیا وہ اتنی مجبور ہو گئی ہے یا بہت جرات مند' ہر دو صورتوں میں اسے بہرحال ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور وہ شدت سے نبیل کا انتظار کرنے لگی' کیونکہ وہ اسے خدشات سے نکالتے تھے اور روزانہ تو نبیل آٹھ بجے تک آ جاتے تھے اس روز جانے کہاں رہ گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے ٹیرس اور ٹیرس سے کمرے تک کے چکر لگا لگا کر تھک گئی اور ان کی آمد ہوئی بھی تو نو بجے وہ بھی آسیہ کے ساتھ جس سے وہ فوراً کچھ کہنے سے رہ گئی۔ البتہ ٹوکنے سے باز نہیں آئی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں پھپھو کے ساتھ تھا۔" نبیل نے بے دھیانی میں جواب دیا اور اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتے آسیہ اس سے بولی۔

"بیٹا! جاؤ پہلے کھانا لگاؤ۔"

وہ نبیل کو دیکھتی ہوئی وہیں سے کچن میں چلی گئی۔

پھر کھانے کے بعد وہ معمول کے مطابق نبیل کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو خلاف معمول وہ ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ اسے دیکھا تو رک گئے اور اسٹک سے چائے کا مگ کارنر ٹیبل پر رکھنے کا اشارا کیا تو وہ بسورتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے جانے کا اشارہ نہیں کیجئے گا۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"بس۔" وہ مگ کارنر پر رکھ کر آرام سے صوفے میں دھنس گئی۔ تو نبیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہی پوچھنے لگے۔

"ہاں، کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟"

"وہ شام میں علی جہانگیر کا فون آیا تھا۔" اس نے رک رک کر بتایا اور نبیل نے ایک دم گردن موڑ کر اسے دیکھا تو سر جھکا کر بولی۔

"میں نے نہیں انہوں نے کیا تھا۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"پریشانی کی بات وہ ہے جو انہوں نے بتائی۔" اس نے فوراً کہا تو نبیل ایک بار پھر چونکے تھے۔

"کیا' کیا بتایا ہے اس نے؟"

"بتا رہے تھے۔ آج مما نے شاہ سکندر کو فون کیا تھا۔" اپنے تئیں اس نے بڑے راز کا انکشاف کیا لیکن نبیل نے یوں سر جھٹکا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو اور چائے کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"آپ کو حیرت نہیں ہوئی نبیل بھائی۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" نبیل نے اطمینان سے کہا تو وہ الجھ کر بولی۔

"ہے کیوں نہیں۔ مما تو شاہ سکندر کا نام بھی نہیں سننا چاہتی تھیں پھر انہیں فون کرنے کا مطلب؟"

"مدیحہ' مدیحہ کے لیے فون کیا تھا۔ اسے واپس بلانا چاہتی ہیں۔ لیکن۔" نبیل ایک دم خاموش ہو گئے۔

"لیکن کیا' وہ نہیں آنا چاہتی؟" اس نے فوراً پوچھا تو نبیل گہری سانس کھینچ کر کہنے لگے۔

"پتا نہیں وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید آنا چاہتی ہے لیکن شاہ پور والے اسے نہیں آنے دے رہے۔ ان کا کہنا ہے پہلے تمہیں رخصت کریں پھر وہ مدیحہ کو یہاں بھیجیں گے۔ یہ انتہائی واہیات کوشش ہے ان کی پھوپھو کو بلیک میل کر رہے ہیں۔"

وہ سناٹے میں آ کر انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

"اب تک ہم یہ سمجھتے رہے کہ مدیحہ وہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہے اور خوش ہے لیکن وہ خوش نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ وہ اس گھر کے علاوہ کہیں نہیں رہ سکتی۔ اس پر جبر کیا گیا تو وہ مر جائے گی۔"

"اف نہیں۔" وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو نبیل ایک نظر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ نیچے گرا کر پوچھنے لگی۔

"پھر آپ اسے کیسے لائیں گے؟"

"لے آئیں گے پہلے تمہارا معاملہ نمٹا لیں۔" نبیل نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ کھینچا۔ پھر اسے دیکھ کر بولے۔ "پھوپھو نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔"

وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی نظریں ان کے ہاتھوں میں پکڑے لفافے پر جا پڑی تھیں جبکہ اندر دل یکلخت خاموش ہو گیا تھا۔

"مدیحہ کو بھیجنے کے لیے جو شرط انہوں نے رکھی ہے۔ پھوپھو پہلے اس کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ کوئی دعوا نہیں کر سکیں گے۔"

نبیل نے کہتے ہوئے لفافے میں سے پیپر نکال کر اس کے سامنے کر دیے جن پر ایک نظر ڈال کر اس نے ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھا تو وہ قدرے رک کر بولے۔

"خلع کے کاغذات ہیں' سائن کر دو۔"

اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کورٹ پیپر دیکھنے لگی، جس پر اس کی طرف سے تحریر لکھی ہوئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ اپنے دل کی بستی اسے اپنے ہاتھوں سے اجاڑنی تھی اور کوئی احتجاج بھی نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ پہلے مرحلے پر ہی اس نے فیصلے کا اختیار کر آسیہ کو سونپ دیا تھا۔

نبیل نے پین اس کے ہاتھ میں تھما کر پیپر پر اس جگہ اپنی انگلی رکھ دی جہاں اسے سائن کرنا تھا۔

اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی قطرہ پلکوں سے گرتا۔ وہ سائن کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے جانے لگی کہ نبیل پکار کر بولے۔

"سنو' میں جانتا ہوں تم پھوپھو کے اس فیصلے سے خوش نہیں اگر کہو تو میں انہیں مزید اقدام سے روکنے کی کوشش کروں۔"

"نہیں نبیل بھائی! مما نے اپنی ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی۔ میں کیا ان کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ ان کے فیصلے کو قبول کر لوں۔"

وہ بہت ضبط سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی، لیکن اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں کا پانی چھلک گیا تھا۔

◉ ◉ ◉

شاہ سکندر کے تین دن اسلام آباد میں بے انتہا مصروف گزرے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی انہیں مدیحہ کا خیال آ رہا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے شاہ پور نہیں رہنے دیں گے۔ جیسا کہ اس نے بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد میں پڑھتی ہے تو وہ اس بہانے اسے اسلام آباد لے آئیں گے اور ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کر دیں گے' اور جب تک آسیہ کا ان کی طرف سے دل صاف نہیں ہو جاتا اور بخوشی انہیں دونوں بیٹیوں سے ملتے رہنے کی اجازت نہیں دے دیتی وہ مدیحہ کو اعتماد میں لے کر آسیہ سے دور ہی رکھیں گے، کیونکہ اس عرصے میں مدیحہ ان کے دل میں الماس اور آغا کے برابر جگہ بنا چکی تھی۔ اس لیے اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آسیہ کی خوشی کی خاطر ہمیشہ کے لیے مدیحہ اور صبا سے دستبردار ہو جاتے۔ ایک بار پہلے وہ آسیہ کی خاطر ایسا کر چکے تھے تب انہیں صرف اس کا خیال تھا اور اب اس کے خیال کے ساتھ بیٹیوں کا احساس بھی تھا جنہیں وہ سمجھتے تھے اب ان کی ضرورت ہے۔ ان کی ماں لاکھ پڑھی لکھی ذہین عورت سہی پھر بھی تنہا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

بہرحال تین روز بعد جب وہ اسلام آباد کی مصروفیات سے نکل کر شاہ پور پہنچے تو سیدھے مدیحہ کے کمرے میں آئے تھے اور اسے موجود نہ پا کر یہی سمجھے کہ کہیں ادھر ادھر یا بی بی جان کے پاس ہو گی، اس لیے اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے مہر النساء سے اس کے بارے میں فوراً انہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی مہر النساء کو یہ بات ناگوار گزرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی ان کی ساری توجہ اس کی اولاد پر مرکوز ہے۔

"آغا کہاں ہے؟" وہ جب ایزی ہو کر بیٹھے تو پہلے مہر النساء سے آغا کا پوچھا تھا۔

"ہارون لالہ کی طرف گیا ہے۔" مہر النساء نے بتایا۔

"خیریت۔ تم نے کسی کام سے بھیجا ہے یا؟"

"شریانو نے بلوایا تھا۔" مہر النساء فوراً بولی تھی۔ "ہو گا اسے کوئی کام۔ آغا آئے گا تو خود ہی اس سے پوچھ لینا۔"

"تم نے نہیں پوچھا تھا؟" انہیں مہر النساء کی غیر ذمہ داری بہت کھٹکی تھی جب ہی ٹوکے بغیر رہ نہیں سکے۔

”مجھے کہاں بتاتا ہے؟“ وہ صاف دامن بچا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے کا کہوں جیراں سے؟“
”ہاں اور ذرا مدیحہ کو میرے پاس بھیج دو۔“ انہوں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔
”وہ تو چلی گئی۔“
”کہاں؟“ وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔
”کراچی اپنی ماں کے پاس۔“ مہر النساء کا انداز بے حد سرسری تھا۔
”کب کس کے ساتھ گئی ہے؟“ ان کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔
”پتا نہیں شاید بابا جان لے گئے تھے۔“
”بابا جان!“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”کہاں جا رہے ہیں۔ میں چائے کا...“
وہ اسے بولتا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے تھے۔
کچھ دیر بعد وہ بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کیونکہ بابا جان فضل دین سے بات کر رہے تھے اور جب اسے فارغ کر کے ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دوبارہ سلام کیا۔
”السلام علیکم۔“
”خوش رہو۔ کب آئے؟“ بابا جان نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔
”کچھ دیر ہوئی۔ ابھی مہر النساء نے بتایا ہے کہ آپ مدیحہ کو کراچی چھوڑ آئے ہیں۔“ انہوں نے جواب کے ساتھ ہی بغیر کسی تمہید کے اپنی بات کہہ دی۔
”ہاں، بہت ضد کر رہی تھی شاید گھبرا گئی تھی یہاں۔ شہر والوں کا بھلا کہاں دل لگتا ہے گاؤں میں۔“ بابا جان اپنے پیچھے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر جانے کیا تلاش کرتے ہوئے بول رہے تھے۔
”لیکن بابا جان! آپ کو میرا انتظار تو کرنا چاہیے تھا۔“ وہ مدیحہ کے جانے کی تصدیق ہوتے پر الجھ گئے تھے۔
”کہا تھا ہم نے اس سے کہ اپنے باپ سے مل کر جانا لیکن وہ نہیں مانی کہنے لگی۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی۔ پھر آؤں گی تو بابا سے مل لوں گی۔“ بابا جان نے مدیحہ کے الفاظ دہرا کر انہیں دیکھا تھا۔
”پتا نہیں پھر آئے گی بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔ لیکن بابا جان سن کر بولے۔
”ضرور آئے گی۔ وعدہ کیا ہے اس نے ہم سے۔“
”آپ خود چھوڑ کر آئے ہیں اسے یا کسی کے ساتھ بھیجا ہے۔“ انہوں نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا۔
”کسی کے ساتھ کیوں بھیجتے، ہم خود لے کر گئے تھے اور اس کے گھر کے سامنے اتار کر آئے ہیں۔“ بابا جان نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں کسی کے ساتھ بھیجنے والی بات بری لگی ہو۔
”اچھا!“ شاہ سکندر یقین کر بھی رہے تھے اور نہیں بھی اور اندر ہی اندر الجھ بھی رہے تھے کہ پانچ روز پہلے آسیہ نے فون پر ان سے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں کتنی صداقت تھی۔

”ابھی رہو گے یہاں یا پھر کہیں جانا ہے؟“ بابا جان نے انہیں سوچتے دیکھ کر فوراً ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔
”بس دو دن ہوں پھر کینیڈا جانا ہے۔“ انہوں نے سرسری اپنا پروگرام بتایا پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ کو معلوم ہے جہانگیر بھائی ڈاکٹر آسیہ کے پاس گئے تھے۔“
”اچھا کب؟“ بابا جان یکسر انجان بن گئے۔
”غالباً ایک ہفتے پہلے۔“
”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“
”ڈاکٹر آسیہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھیں، جہانگیر بھائی نے صباحت کی رخصتی پر زور دیا اور جب وہ نہیں مانیں تو دھمکی کے طور پر یہ کہہ آئے کہ مدیحہ ان کے قبضے میں ہے۔“ شاہ سکندر صاف گوئی سے بتا کر کہنے لگے۔
”جہانگیر بھائی بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کروں گا، برسوں پہلے آپ نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اب آپ سن لیں کہ اس گھر میں میری بیٹیاں رہتی ہیں۔ دھمکی تو دور کی بات اگر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا بھی گیا تو...“
وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ بھینچ گئے۔
”تم ناحق بدگمان ہو رہے ہو سکندر۔ تمہاری بیٹیاں کیا ہماری کچھ نہیں لگتیں۔ خون ہیں ہمارا اور تم سے پہلے ہم جہانگیر سے پوچھیں گے کہ اس نے ڈاکٹرنی سے ایسی بات کیوں کی؟“
بابا جان گو کہ اندر ہی اندر صورت حال سے بوکھلا گئے تھے۔ لیکن ظاہر نہیں کیا اور ان کی طرف داری کرتے ہوئے شاہ جہانگیر پر غصہ کرنے لگے تھے۔
”بہر حال جہانگیر بھائی کو دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کینیڈا سے واپسی پر صباحت کا معاملہ میں خود طے کروں گا۔“ وہ خفگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”ہاں اور کوشش کرنا، مدیحہ کی بات بھی یہیں طے ہو جائے۔ تیمور کے ساتھ۔“ بابا جان نے کہا تو وہ الجھ کر رہ گئے تھے۔

❁ ❁ ❁

”کتنی خوب صورت جگہ ہے اور کتنا سکون ہے یہاں۔ میرا بس چلے تو میں ساری زندگی کے لیے یہیں رہ جاؤں۔“ وہ چاروں اور دیکھتی ہوئی ایک جذب کے عالم میں بولی تھی۔
چند قدم آگے چلتا شاہ تیمور اس کی بات سن کر رک گیا اور پلٹ کر پوچھنے لگا۔
”رہ سکو گی؟“
”کیوں نہیں، یہ تو میرے خوابوں سے بھی زیادہ حسین جگہ ہے۔ لیکن میرے اور کون سے خواب پورے ہوئے جو یہ ہوگا؟“ وہ اچانک آزردہ نظر آنے لگی۔ لہجے میں بھی دکھ سمٹ آیا تھا جسے محسوس کر کے شاہ تیمور اس کے قریب آ گیا۔
”تم خواب بھی دیکھتی ہو؟“
”جنہیں حقیقت میں کچھ میسر نہ ہو وہ خواب ہی دیکھتے ہیں۔“

وہ کالج کی طرف جاتی سرخ بجری کی روش پر قدم رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اور صبا کس ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ کاش بابا شروع ہی میں ہمیں اپنے پاس لے آتے تو ہمارے اندر اتنی محرومیاں نہ ہوتیں۔ ہر بات ہر چیز کو ترسے ہیں ہم۔ مما کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا لیکن انہوں نے اور ان کے سب گھر والوں نے ہمیں ہی قصوروار سمجھا یا جیسے ہی ہم سے بدلے لیتے رہے۔ بہت زیادتیاں ہوتی ہیں ہمارے ساتھ۔"

"پھر بھی تم وہاں جانا چاہتی ہو؟" شاہ تیمور نے فوراً ٹوکا تو وہ ایک دم تیز ہو کر بولی۔

"کس نے کہا' میں جانا چاہتی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میں کبھی نہیں جانا چاہتی میرے تو دوبارہ وہاں جانے کا سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ برا سلوک ہوگا میرے ساتھ۔ لیکن میں کیا کروں۔ ادھر بابا جان کی حویلی میں بھی میرے لیے جگہ نہیں ہے شاید۔"

"ارے یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میں محسوس کر سکتی ہوں شاہ تیمور! کوئی نہ کہے تب بھی میں جانتی ہوں کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ پاپا کو بھی میری پروا نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری اصل شناخت یہیں سے ہے۔ اگر مما نے اتنی پابندیاں نہ لگائی ہوتیں تو میں بہت پہلے یہاں آ چکی ہوتی اور اپنے ساتھ صبا کو بھی لے آتی۔"

"تیرہ وہ تو اب آ ہی جائے گی اور تم بھی نہیں جاؤ گی۔" شاہ تیمور نے کہا تو وہ قدم روک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں کہہ رہا ہوں ناں تم نہیں جاؤ گی۔" اسے یقین دلانے کی خاطر اس نے زور دے کر اپنی بات دہرائی پھر کہنے لگا۔ "تمہیں یہ کالج پسند ہے تو ہم یہیں رہیں گے۔"

"ہم۔" اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہو کر پھر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

"تم اور میں' یا تمہیں میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض ہے۔" شاہ تیمور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ نروس سی ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں!"

"ارے!" وہ ذرا سا ہنسا۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تمہارے خوابوں کو تعبیر دینے کی بات کر رہا ہوں۔ سچ بتاؤ اپنے خوابوں کی حسین راہ گزر پر تم کس کا ہاتھ تھام کر چلتی رہی ہو' کوئی ماورائی مخلوق یا مجھ جیسا عام انسان۔"

"عام سا میرے خدا۔" وہ بھاگ کر کالج کا گیٹ پار کر گئی۔

شاہ تیمور خوشگوار سے احساس میں گھر کر اس کے پیچھے دیکھتا رہا۔ کوریڈور سے آگے جب وہ کلاس روم کے اندر غائب ہو گئی تب جیب سے موبائل نکال کر بابا جان کے نمبر پش کرنے لگا۔

"السلام علیکم بابا جان! میں تیمور بات کر رہا ہوں۔"

"جی سب ٹھیک ہے۔"

"نہیں بابا جان! کوئی مسئلہ نہیں بلکہ وہ تو بہت خوش ہے یہاں۔"

"آپ شاید اسے سمجھے نہیں۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"جی جی۔"

"اگر آپ کہیں تو اسے شاہ پور لے آؤں؟"

"اچھی بات ہے۔ ویسے آپ سکندر چچا کو ابھی بتا دیں کہ ان کی بیٹیاں اپنی ماں کے پاس خوش نہیں ہیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

"خدا حافظ!" اس نے موبائل بند کر کے واپس جیب میں رکھا پھر اس کے پیچھے اندر آیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

"ارے!" شاہ تیمور نے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹی پھر جانے کیا ہوا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"ارے مدیحہ!" شاہ تیمور نے آہستگی سے اس کی دونوں کلائیاں تھام کر ہاتھ پیچھے کیے۔ "کیا ہوا ہے؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے مجھ سے؟" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا اس کی طرف جھکا۔

"نہیں۔" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"پھر!"

"اپنی قسمت سے' اپنے خوابوں سے' کہیں مجھے رسوا نہ کر دیں۔"

"بیوقوف! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اپنے دل سے سارے ڈر' سارے خوف نکال دو اور بھول جاؤ اب تک جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ بہت جلدی ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔"

وہ بہت مضبوط لہجے میں اسے اپنی ذات کا مان دے رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا تم میرا یقین نہیں کر رہیں؟"

وہ ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔ تب ہی باہر گاڑیاں رکنے کی آواز پر چونک کر بولا۔

"لو آ گئے سب لوگ۔"

"کون؟" اس نے بے دھیانی میں پلٹ کر پوچھا۔

"کزنز..... جاؤ تم منہ دھو لو ورنہ سب سمجھیں گے' میں تم پر ظلم و ستم توڑتا ہوں۔" اس نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھاگ کر واش روم میں بند ہو گئی۔

چند لمحوں بعد سارے میں ایک شور مچ گیا۔ علی جہانگیر بھی آیا تھا جسے دیکھ کر شاہ تیمور حیرت بھری آواز میں چلایا۔

"ارے ڈی سی صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔"

مدیحہ واش روم سے نکل کر آ رہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔

"کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔"

"ہائیں! تم ہمارے قافلے میں تو نہیں تھیں۔" علی جہانگیر نے حیران ہو کر مدیحہ کو دیکھا تو اس سے پہلے شاہ تیمور بول پڑا۔

''ہم تو آپ کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے آ گئے تھے۔''

''اچھا!'' علی جہانگیر ایک نظر شاہ تیمور پر ڈال کر پھر سوچتے ہوئے انداز میں مدیحہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ قصداً مسکرا کر بولی۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک اور اس کالج میں آ کر تو بہت خوش۔''

''تیمور بھائی! کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟'' ایک طرف سے رابعہ نے پکار کر پوچھا تو شاہ تیمور ادھر متوجہ ہو گیا۔

''زبردست، سب کی فیورٹ ڈشز تیار کروائی ہیں۔''

''پھر دیر کس بات کی ہے؟ بس فوراً دسترخوان بچھواؤ پھر مجھے جانا ہے۔'' علی جہانگیر نے کہا۔

''کیا مطلب؟ آتے ہی جانے کی بات کرنے لگے۔''

''بس یار! میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ سکندر چچا سے ملنا تھا لیکن وہ میرے شاہ پور پہنچنے سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اب پتا نہیں کراچی میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں۔ پانچ بجے ان کی کینیڈا کی فلائٹ ہے۔''

علی جہانگیر نے کہا تو مدیحہ بے ساختہ پوچھنے لگی۔

''پاپا کینیڈا جا رہے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟''

''ہفتہ دس دن تو لگیں گے، تم چلنا چاہو کراچی تو میرے ساتھ چلو۔'' علی جہانگیر نے جواب کے ساتھ کہا تو تیمور فوراً بول پڑا۔

''نہیں، یہ میرے ساتھ جائے گی کیوں مدیحہ؟''

''جی!'' اس کے جواب پر علی جہانگیر ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

''جیسے تمہاری مرضی، اب پلیز کھانا۔''

''ہاں، چلو مدیحہ! میزبانی کے فرائض نبھاؤیں۔'' شاہ تیمور نے چلتے ہوئے مدیحہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جس سے سب حیران ہو کر دیکھنے لگے تھے۔

پھر کھانا کھاتے ہی علی جہانگیر بہت عجلت میں سب کو خدا حافظ کہتا ہوا نکل گیا تو کتنی دیر تک سب اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ خصوصاً اس کی شادی پر جو بدمزگی ہوئی تھی اس کا سب کو افسوس تھا۔ اور یہ کہ ابھی تک اس کا معاملہ طے کیوں نہیں ہوا؟

''بابا جان ڈھیل دے رہے ہیں ورنہ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔'' شاہ عزم نے کہا تو آغا اس کی تائید کرتا ہوا بولا۔

''ہاں جیسے میرے باپ کو ڈھیل دی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں اس چنگل سے نکالنا تھا اور علی کو پھنسانا ہے۔ ہا ہا ہا۔'' آخر میں اس کے ساتھ دو چار قہقہے اور بھی شامل ہو گئے تھے۔

مدیحہ کچھ پریشان سی ہو کر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔ معاً شاہ تیمور کی اس پر نظر پڑی تو سب کو خاموش کراتے ہوئے بولا۔

''یہ کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے۔ چلو مدیحہ! ہم باہر چلتے ہیں۔''

''لگتا ہے علی کی طرح یہ بھی۔'' عازم کے تمسخرانہ انداز پر وہ اسے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سب کے درمیان سے مدیحہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھا دیا۔

''کہاں لے جاؤ گے اسے؟'' آغا نے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا مدیحہ کو لے کر چل پڑا تو عقب سے الماس کی آواز آئی تھی۔

''اپنی ماں کا انجام بھول گئی ہے یہ۔''

''اب تو آپ کو یقین آ گیا ہے کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔'' گیٹ سے نکلتے ہی مدیحہ نے دکھ سے کہا۔

''میں! میں جو کرتا ہوں' کیا تمہارے لیے صرف میری محبت کافی نہیں ہے؟ اور کسی کی پروا مت کرو۔''

''کیسے نہیں کروں۔ آپ نے سنا نہیں۔ الماس کیا کہہ رہی تھی۔ اگر پاپا کی طرح آپ نے بھی مجھے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''بے وقوف! سکندر چچا نے تمہاری ماں کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا۔ بابا جان نے مجبور کیا تھا انہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر روش پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ساری کہانی دہرانے لگا تھا۔

وہ سراسیمہ سی سن رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

علی جہانگیر ایئر پورٹ پر بس تھوڑی دیر کے لیے شاہ سکندر سے مل سکا تھا اور اصل بات جو وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا وہ بھی نہیں پوچھ سکا کیونکہ وہ اپنے وفد کے ساتھ تھے۔ اس لیے بس سلام دعا ہی ہوئی۔ البتہ اس بات پر اس نے بہت زور دیا کہ کینیڈا سے واپسی پر وہ شاہ پور جانے سے پہلے اس کے پاس آئیں، اسے ان سے بہت ضروری کام ہے اور انہوں نے ہامی تو بھر لی تھی پھر بھی وہ ان کی واپسی کی تاریخ کنفرم کر کے آیا تھا تاکہ خود انہیں ریسیو کرنے جا سکے۔ اصل میں وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آسیہ نے ان سے صباحت اور اس کے متعلق کیا بات کی۔ غلط ہی بات تھی وہ یہی سوچ سکتا تھا، مدیحہ کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں گیا تھا۔ بہر حال شاہ سکندر کو سی آف کر کے جب وہ گھر پہنچا تو کرم دین چائے کے ساتھ ہی اسے ایک لفافہ تھما کر بولا۔

''ابھی ایک آدمی دے گیا ہے۔ میرا انگوٹھا بھی لگوایا تھا اس نے۔''

''اچھا جاؤ۔'' وہ لفافے پر نام دیکھ رہا تھا۔ فوراً کرم دین کو بھیج کر چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور لفافہ کھول کر پیپر نکالتے ہی ٹھٹک گیا۔ پھر جب تحریر نظروں دوڑائیں تو بری طرح چکرا گیا۔ دل کسی طرح یقین نہیں کر رہا تھا کہ صباحت خلع کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

''میرے خدا۔'' اس نے صوفے کی بیک پر سر رکھا تو اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا جو بات گمان میں نہیں تھی وہ ہو گئی تھی۔

گزشتہ تین چار روز سے وہ کتنا تجسس ہونے کے ساتھ پر امید تھا کہ آسیہ اور شاہ سکندر کے درمیان رابطہ ہونے سے اس کا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا اور اس خیال کے ساتھ اس نے اس بزدل سی لڑکی کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی تھی۔ کبھی لان میں تو کبھی کچن میں اور بیڈ روم میں جانے کیوں وہ دبے پاؤں داخل ہوتی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اسے دیکھتا تھا محسوس کرتا تھا، اور کبھی بے اختیار اسے چھونے کے لیے اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھ کر رہ جاتا۔ تو اسے لگتا جیسے وہ کسی کونے میں کھڑی ہنس

رہی ہے۔ کیسی مدھر سی ہوتی تھی جو اس کے اندر خوشگوار سی ہلچل مچا دیتی تھی۔

"نہیں صباحت شاہ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو زور سے دبایا پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا اور ٹیلی فون سیٹ قریب کھینچ کر اس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تیسری بیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

"ہیلو!"

"مجھے ابھی تمہاری طرف سے نوٹس موصول ہوا ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے بھیجا ہے یا؟" وہ چھوٹتے ہی تیز لہجے میں بولا۔

"اپنی مرضی سے بھیجا ہو یا کسی اور کی کیا فرق پڑتا ہے۔" ادھر وہ بارہی ہوئی لگ رہی تھی۔

"فرق پڑتا ہے صباحت شاہ فرق پڑتا ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔ "تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہی ہو۔"

"میں فون بند کر رہی ہوں۔"

"یہی کر سکتی ہو تم۔" اس نے خود ہی ریسیور پٹخ دیا۔

اس لڑکی کو وہ نہیں سمجھ سکتا تھا اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کبھی سوچتا خود ڈاکٹر آسیہ کے پاس جائے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ صباحت کے ساتھ وابستگی بھی بتا ڈالے۔ لیکن زیادہ دیر تک وہ اس سوچ پر قائم نہیں رہ سکا کیونکہ اس کے خیال میں وہ ڈاکٹر آسیہ سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا البتہ شاہ سکندر صباحت پر اپنا حق جتا کر کچھ بھی کہہ سن سکتے تھے۔ لیکن وہ بھی آج ہی باہر گئے تھے اور ایک ہفتے سے پہلے ان کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ ہفتہ کیا مہینہ انتظار کر سکتا تھا اور اب تو جیسے ایک ایک پل اتنا اہم تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ وقت کو یہیں روک دیتا جو اس کی زندگی چھیننے کے درپے ہو گیا تھا۔

آخر بہت سوچنے کے بعد اس نے بابا جان کو فون کیا اور جب انہیں نوٹس کا بتایا تو وہ چیخ پڑے تھے۔

"پاگل ہو گئی ہے وہ عورت' اپنی زندگی سے سبق نہیں سیکھا اس نے جو اب بیٹی کو طلاق دلوا کر گھر اٹھانا چاہتی ہے۔ اسے سمجھا دو کورٹ کچہری کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے پورے خاندان کو گھسیٹ لیں گے۔"

"بس کریں بابا جان! غصے اور جوش سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو گا نہ ہی میں کوئی دھماکہ کرنا چاہتا ہوں آپ میری امی اور ابا کو بھیجیں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔" اس نے بمشکل لہجے میں ٹوک کر کہا۔

"کیا تھا تمہارا باپ' اسی پر تو ڈاکٹرنی نے یہ قدم اٹھایا ہے۔" بابا جان سخت تلملائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"کب؟ کب گئے تھے ابا؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ایک ڈیڑھ ہفتہ ہوا ہے۔ بہت بے عزتی کی اس عورت نے تمہارے باپ کی اس کے بعد بھی اگر تم چاہتے ہو کہ ہم دوبارہ اسے وہاں جانے کو کہیں تو۔"

"نہیں۔" وہ ایک دم بول پڑا۔

"پھر بتاؤ' ہم کیا کریں۔"

"فی الحال تو میری اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سارے قصے میں صباحت

کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لیے اس کی ماں کے کیے کی سزا اسے نہیں ملنی چاہیے۔" اس نے کہا۔

"اسی کا خیال کر کے تو ہم خاموش ہیں ورنہ۔" بابا جان فوراً بولے اور خاموش بھی ہو گئے۔

"اچھا بابا جان! میں پھر بات کروں گا۔" اس نے اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

اور پھر بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب شاہ سکندر ہی کو ڈاکٹر آسیہ کے پاس جانا چاہیے اور اس کے لیے اسے بہت تحمل سے شاہ سکندر کا انتظار کرنا تھا۔

✿ ✿ ✿

فون کی بیل بج رہی تھی۔

نبیل نے کچھ دیر انتظار کیا کہ صباحت فون اٹھائے گی' لیکن وہ پتا نہیں کہاں تھی آخر انہیں خود ہی کمرے سے نکلنا پڑا کیونکہ دوسری طرف کوئی مستقل مزاجی سے منتظر تھا۔

"ہیلو!" نبیل نے ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف کی آواز سنتے ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔

"مدحو کیسی ہو؟ کہاں ہو؟"

"اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"کیا' کیا کہا تم نے؟"

ان کی سماعتوں نے جانے کیا سنا تھا کہ پورا وجود سن ہو گیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ نیچے گرا کر ریسیور رکھا تھا۔ اس کے بعد بھی وہیں کھڑے رہے۔ اتفاق سے اسٹک بھی ہاتھ میں نہیں تھی ورنہ اس کے سہارے خود کو گھسیٹ لیتے۔ انتہائی بے بسی سے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار صباحت کو پکارا تھا۔

"صبا!"

صباحت اپنے کمرے سے نکل کر آئی اور انہیں دیکھتے ہی ٹھٹھک گئی تھی۔

"کیا بات ہے نبیل بھائی؟"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ بولے کچھ نہیں تو قریب آ کر صباحت نے ان کا بازو تھام لیا۔

"کیا ہوا بھائی۔ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" پھر فون پر نظر پڑی تو اندر ہی اندر پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ "کس کا فون تھا؟"

"کسی کا نہیں' وہ میں نے اسٹک پتا نہیں کہاں چھوڑ دی۔" انہوں نے بات بناتے ہوئے خود کو سہارا دینے کی خاطر صباحت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس نبیل بھائی! اب اسٹک کا پیچھا چھوڑ بھی دیجیے۔ اس کے بغیر چل تو سکتے ہیں۔" وہ ان کی اسٹک سے چڑ کر بولی تھی۔

"کیا کروں' عادت ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر خود کو خالی خالی سا محسوس کرتا ہوں ابھی دیکھو ہاتھ میں نہیں تھی تو میں۔" وہ جانے کیا کہتے جا رہے تھے کہ ایکدم خاموش ہو گئے۔

"یہ یہاں رکھی تو ہے۔" صباحت ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے اسٹک دیکھ کر بولی۔

"اوہ' میں سمجھا' شاید راستے میں کہیں گر گئی۔" انہوں نے قصداً حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"گر ہی جاتی تو اچھا تھا۔" وہ یونہی کہہ گئی۔

"کیوں کیا تمہیں بھی مدحو کی طرح اس کی آواز بری لگنے لگی ہے۔" انہوں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تو وہ اپنی یونہی کہی گئی بات پر جز بز سی ہو کر بولی۔

"نہیں تو۔"

"اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے خوامخواہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔" وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔" اس نے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو نبیل نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر اپنے سامنے فائل کھول دی اور بظاہر اس پر نظریں دوڑانے لگے جبکہ ذہن مدحیہ کو سوچنے لگا تھا۔ اس کی آواز ہمیشہ کی طرح کھنکتی ہوئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی دباؤ میں ہے۔ بلکہ یہاں سے بھی زیادہ آزاد جب ہی تو اپنے بارے میں فیصلہ کر کے خوش ہو کر انہیں بتا رہی تھی۔ ان کی سماعتوں میں ابھی بھی اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ جو ان کی روح پر کسی تازیانے سے کم نہیں تھے اور جب آپ یہ پھوپھی سنیں گی تو۔

اس سے آگے سوچ کر ہی وہ پریشان ہو گئے اور بے حد مضطرب۔ تب ہی صباحت انہیں پکار کر پوچھنے لگی۔

"نبیل بھائی! کس کا فون تھا؟"

"کب؟" انہوں نے بہت سنبھل کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لابی میں کھڑے تھے۔ مجھ سے مت چھپائیے میں نے خود بیل سنی تھی اور آپ کو اٹینڈ کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ صباحت کے ذہن میں علی جہانگیر کا خیال تھا جب ہی وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس نے کیا کہا۔

"پھر اس میں الجھنے کی کیا بات ہے۔ کیا میرا فون نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا۔" وہ الجھ گئی۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"ہاں چھپا رہا ہوں، ضروری نہیں ہے کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔" انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔ شاید بہت ضبط کرنے کی وجہ سے۔

"اور تم اب کیا جاننا چاہتی ہو۔ تمہارے بارے میں پھوپھو نے جو فیصلہ کرنا تھا، کر لیا اور اس پر تم سے دستخط بھی کروا لیے اور شاید علی جہانگیر کو بھجوا بھی چکی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر بولی۔

"پھر اور کیا جاننا چاہتی ہو۔ اس نوٹس پر علی جہانگیر کا رد عمل تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں قیاس کر سکتا ہوں۔" ان کا لہجہ ہنوز تھا۔ جس پر وہ چڑ کر کہنے لگی۔

"آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بالکل میری طرح ہیں آپ۔ آپ بزدل اور کم ہمت، اپنے آپ پر ذرہ برابر بھروسا نہیں ہے آپ کو۔"

"ہاں!" وہ اچانک جیسے ٹوٹ گئے۔ "اپنے آپ پر بھروسا ہوتا تو یوں جانے دیتا اسے، کبھی نہیں اور وہ بھی کیسی نادان ہے سرابوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔"

"کون؟" وہ ان کے ٹوٹتے لہجے پر گم صم سی ہو گئی تھی۔

"مدحو جانتی ہو اب وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟" انہوں نے اپنے خیال سے نکل کر اسے دیکھا اور اس کی نفی میں سر ہلانے پر گہری سانس کھینچ کر بولے۔

"شادی۔"

"کیا!" صباحت کے صرف ہونٹ کھلے تھے، حلق سے آواز نہیں نکلی تھی اور نبیل بھی جیسے کسی پاتال میں سے بول رہے تھے۔

"ہاں، ابھی اس کا فون آیا تھا۔ خود بتا رہی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے۔ شاہ تیمور کے ساتھ۔"

"نہیں۔" صباحت کا سر نفی میں ہلتا چلا گیا اور نبیل نے جیسے تھک کر چیئر کی بیک پر سر ٹکا دیا تھا۔

❁ ❁ ❁

کتنی دیر بعد صباحت اپنی جگہ سے اٹھ کر نبیل کے پاس آئی اور آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

"نبیل بھائی! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے ہمیں؟"

نبیل اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"جرم ہمارا نہیں، ہمارے ماں باپ کا ہے۔ جنہوں نے اپنی اپنی انا میں اولاد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر ہماری خاطر ہی آپس میں کمپرومائز کر لیتے تو ہم ادھورے ہوتے نہ ہمیں ایسے حادثات پیش آتے۔ میں، مدحو، تم، ہم میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہے۔ ہمارے اندر ہمیشہ ایک محرومی کا احساس رہا جس نے ہماری شخصیت کی تکمیل نہیں ہونے دی۔

"تم حد درجہ حساس۔ اس کے ساتھ تمہارے لاشعور میں ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں کوئی تمہیں تمہاری ماں یا باپ کا طعنہ نہ دے مارے۔ ہر مقام پر جھجکتی اور ٹوٹتی چلی گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ تمہارے اندر لڑنے اور احتجاج کرنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ تھی، لیکن اس خوف نے تمہیں اپنا دفاع تک نہیں کرنے دیا۔

اور مدحو پر اس خوف نے الٹا اثر ڈالا۔ یعنی تمہارے بالکل برعکس وہ بے حس، خود سر اور باغی ہو گئی اور اپنی محرومی کا بدلہ ہر ایک سے لینے لگی اور وہی ٹھیک ہے۔ جو نہ جھجکتی ہے نہ ٹوٹتی ہے۔ اور جو چاہتی ہے، چھین لیتی ہے۔ کسی کی پروا نہیں کرتی۔ میں اب سے نہیں، شروع سے اسے پسند کرتا ہوں۔ مجھے وہ چیخ چلا کر اپنی بات منواتی ہوئی ہمیشہ اچھی لگی۔ لیکن وہی بات جو ابھی تم نے کہی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے اپنے آپ پر بھروسا نہیں ہے۔

ہاں بھروسے اور اعتماد کی کمی نے ہی مجھے بزدل بنا دیا، جو میں اس کے سامنے اظہار نہیں کر سکا اور تمہاری طرح میں بھی ہر مقام پر جھکتا اور ٹوٹتا چلا گیا۔ حالانکہ سب لوگ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن یہ ساری محبتیں بھی ہمارے اندر محرومی کے احساس کو کم نہیں کر سکیں۔ اس لیے کبھی صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کر سکے۔ ہم ڈرتے ہیں۔ ہمیشہ ڈرتے رہیں گے۔"

نبیل کے لہجے میں دکھ تھا، تھکن بھی سمٹ آئی تھی۔

وہ چپ چاپ کھڑی انہیں سن رہی تھی۔ جب آخر میں انہوں نے ہونٹ بھینچ کر جانے یقیناً تلخی اپنے اندر اتاری یا اندر کی تلخی کو باہر آنے سے روکا، تب وہ کھوئی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔

"اور نبیل بھائی! مدحو؟"

"اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنے آپ سے بھی بھاگ رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں تک جائے گی۔ خدا کرے کسی راستے میں بیچ بیچ اس کی منزل آ جائے۔ وہ پائے اپنی منزل۔ ہم میں سے کوئی ایک تو۔" وہ بولتے ہوئے خود ہی چونکے اور جیسے اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ نبیل بھائی! اور جب مما سنیں گی تو کتنی پریشان ہوں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"دکھ اور پریشانی کی بات تو ہے' لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ابھی پھوپھو کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تمہاری ٹینشن انہیں کیا کم ہے؟"

"اور..... اور کیا کہہ رہی تھی مدحو؟"

"کچھ نہیں' بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے یا پھر اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میرا معاملہ کورٹ میں چلا گیا ہے۔" اس نے پرسوچ انداز میں کہا تو نبیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔

"بس ختم کرو یہ موضوع۔ کہیں پھوپھو سنتی ہوئی نہ آ جائیں۔ اور ہاں دیکھو' میں تمہارے لیے ایک کتاب لایا تھا۔ وہ تکیے کے پاس رکھی ہے' لے لو۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے کتاب کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر بولی۔

"میرا کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"دل چاہے یا نہ چاہے پھر بھی پڑھنی ہے۔ اٹھاؤ اسے۔" انہوں نے رعب سے کہا تو اس نے بڑھ کر کتاب اٹھائی اور وہیں صفحے الٹنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر بولے۔

"یہاں نہیں، اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے لیکچر تیار کرنا ہے۔"

"تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ایسے ہی لیکچر دینے میں ماسٹر ہیں۔"

وہ کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل گئی تو انہوں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر آ کر لیٹ گئے۔ لیکچر تیار کرنے کا تو بہانہ تھا۔ اصل میں تنہائی چاہتے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ تنہائی کتنی عذاب ہو گی لیکن وہ شاید اذیت پسند ہو رہے تھے۔ اپنے جرم پر خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتے تھے۔ مدحہ سے محبت کر کے انہوں نے جرم ہی کیا تھا۔ وہ تو ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ بلکہ شروع سے خود کو سرزنش کرتے آ رہے تھے جانے کیوں وہ خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی بہت اعلیٰ و ارفع اور ناقابل حصول نہیں تھی، لیکن انہیں ایسی ہی لگتی تھی۔ سب سے الگ، سب سے جدا۔ شاید اس لیے کہ نظروں میں سما کر ان کے دل میں اتر گئی تھی اور جو دل میں اتر جائیں وہ یوں ہی سب سے الگ، سب سے جدا لگتے ہیں۔ بہر حال اس میں ان کا شعوری عمل دخل نہیں تھا۔ یوں بھی دل کے معاملے میں کبھی کبھی انسان بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بے اختیار تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی اس کے حصول کی تمنا نہیں کی تھی۔ اپنی محبت کو اس غرض سے پاک ہی رکھا تھا اور نہ کہیں یہ سوچا کہ وہ ان کی نہیں تو کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس کے لیے اچھا ہی سوچتے تھے۔ جب اس کی احمر کے ساتھ منگنی ہوئی تھی، تب بھی وہ خوش تھے تو اس خیال سے کہ وہ احمر کے ساتھ خوش رہے گی۔ کسی وقت اپنی تہی دامنی کا خیال آتا تو وہ فوراً سر جھٹک دیتے تھے۔

پھر انہیں احمر کے ہاتھ شادی کر لینے کا دکھ بھی اس کی وجہ سے تھا۔ ایک بار بھی اپنی محبت میں خود غرض ہو کر نہیں سوچا۔ بس اس کے دکھ کا احساس تھا جو وہ اب تک احمر سے ناراض تھے۔

اور اب گو کہ اس نے بہت خوش ہو کر بتایا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے ساتھ شادی کر رہی ہے' لیکن انہیں شدید دھچکا لگا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے اندر اسے پانے کی کوئی تمنا جاگ اٹھی تھی' بلکہ انہیں یقین تھا کہ اس کی یہ خوشی دیرپا نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً دھوکا کھانے جا رہی ہے اور یہ سراسر اس کا اپنا عمل' اپنا فعل تھا۔ اس کے باوجود جانے کیوں وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ شاید ان کے لاشعور میں کہیں یہ خیال تھا کہ وہ اگر صحیح وقت پر اپنے جذبوں کا اظہار کرنے کے ساتھ اسے خوبصورت زندگی دینے کا وعدہ کرتے تو وہ کبھی فرار کا راستہ اختیار نہ کرتی اور اب تو جیسے اس کے ہر عمل کے ذمہ دار وہی ہوں گے۔

"کاش میں تمہیں سمجھا سکتا' روک سکتا مدحو!" انہوں نے بے بسی اور دکھ سے سوچا تھا۔

اور پھر رات کے تیسرے پہر جب وہ ہر طرح سونے کی کوشش میں ناکام ہو گئے تو اٹھ کر ٹیرس پر آ گئے۔ خاموش فضا میں ہوا کی سرسراہٹ بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جبکہ روشنی کہیں نہیں تھی۔ ان کا دل چاہا، ساری سوچوں کو جھٹک کر یہیں ٹھنڈے فرش پر سو جائیں۔ کتنی دیر ادھر سے ادھر ٹہل کر وہ اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب کسی حد تک کامیاب ہو گئے' تب لالی میں آ کر امریکا کی کال ملانے لگے، کیونکہ خود کو قصوروار سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں بار بار احمر کا خیال بھی آ رہا تھا کہ وہ اگر مدحہ کے ساتھ وفاداری نبھاتا تو وہ کبھی یہاں سے نہ جاتی۔ بہر حال چند لمحوں بعد جب ادھر احمر لائن پر آیا تو وہ چھوٹتے ہی بولے تھے۔

"تمہارے ایک غلط قدم نے یہاں کس کس کی زندگی خراب کی۔ کبھی سوچا تم نے؟"

"کون؟ نبیل بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" احمر ان کی آواز سن کر جہاں خوش ہوا' وہاں الجھ بھی گیا تھا۔

"تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے چبا چبا کر کہا تو احمر جیسے سمجھ کر گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر شرمندہ ہوں۔"

"ہاں تم کیوں شرمندہ ہو گے۔ شرمندہ تو میں ہوں' میں نے پھوپھو کو یقین دلایا تھا کہ مدحو کے لیے تم سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" ان کا لہجہ ہنوز تھا۔

"آپ کو شرمندہ ہونا بھی چاہیے' کیونکہ آپ نے پھوپھو سے غلط بیانی کی تھی۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ مدحو کے لیے بہتر کون تھا۔" احمر ان کی بات سے خائف ہونے کے بجائے آرام سے بولا تو انہوں نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"کون؟"

"آپ۔" احمر نے ان پر چڑھے اپنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھنا گیا۔ بند ہونٹ کھلے تو بہت کمزور آواز نکلی تھی۔

"میں۔"

"جی آپ۔ کیوں خود کو چھپائے رکھا آپ نے۔ محبت گناہ تو نہیں ہے جس کے اعتراف پر آپ کو دار پر لٹکا دیا جاتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو احمر!" وہ ہتھی لہجے میں بولے۔ جیسے خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ غلط کام میں نے نہیں' آپ نے کیا تھا۔ میں تو شکر ہے بچ گیا، ورنہ اگر مدحو سے

شادی کے بعد مجھے آپ کے جذبوں کی خبر ہوتی تو میں ساری زندگی انگاروں پر چلتا۔ اب آپ پوچھیں گے مجھے کیسے خبر ہوئی تو نبیل بھائی! وقت رخصت جب میں نے آپ سے کہا تھا مدحو کا خیال رکھیے گا تو آپ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس وقت آپ کے دھیان میں یقیناً مدحو تھی' جو آپ نے بہت دھیمی آواز میں خود کلامی کی تھی۔ ''کوئی اپنی زندگی سے بھی غافل ہوتا ہے۔'' احمر بہت روانی میں بول رہا تھا۔ ایک لمحہ کو رکا پھر شروع ہو گیا۔

''بس نبیل بھائی! وہ ایک لمحہ تھا جس نے آپ کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا آپ کہیں نظر نہیں آیا۔ سارے منظروں میں آپ ہی آپ تھے، پھر میں کیوں زبردستی اپنا آپ منواتا اور اگر منوا بھی لیتا تو کیا ملتا مجھے؟''

''مدحو!'' وہ گم صم کھڑے تھے چونک کر بولے۔ ''وہ تو تم سے محبت کرتی ہے۔''

''نہیں' وہ صرف اپنا آپ منوانا چاہتی تھی اور آپ تو اسے شروع سے مانتے ہیں۔ اس لیے وہ صرف آپ کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ بس اب دیر نہیں کریں نبیل بھائی! اس سے پہلے کہ......'' احمر کی بات جاری تھی کہ لائن کٹ گئی۔

''میرے خدا!'' ان کا ریسیور والا ہاتھ یوں نیچے گرا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو' پھر اپنے کمرے میں بھی خود کو گھسیٹتے ہوئے آئے تو مدحیہ کے ساتھ احمر کا دکھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

❁ ❁ ❁

شاہ تیمور اسے پھوپھو شہر بانو کے پاس چھوڑ کر خود شاہ پور چلا گیا تھا۔

اور گو کہ ریسٹ ہاؤس اور کالج کی نسبت وہ پھوپھی کے گھر میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی' اس کے باوجود سکون سے سو نہیں سکی۔ رات بھر وقفے وقفے سے اس کی آنکھ کھلتی رہی تھی پھر بھی صبح اس نے جلدی بستر چھوڑ دیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد کمرے سے نکل کر پھوپھو شہر بانو کو ڈھونڈتی ہوئی گول برآمدے میں آئی تو وہاں ان کی بیٹی سحر رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مرغیوں کے آگے ڈال رہی تھی۔ اسے دیکھا تو قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

''تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟''

''بس اچانک آنکھ کھل گئی پھر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی۔'' وہ کہتی ہوئی چارپائی کے کنارے ٹک گئی۔

''آرام سے بیٹھو۔ لسی پیو گی؟''

''نہیں۔ لسی نہ چائے۔ سب کے ساتھ ناشتا کروں گی۔'' وہ اس کے سامنے سے روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر مرغیوں کو ڈالتے ہوئے بولی۔

سحر خاموش رہی تو قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔

''پھوپھو کب اٹھیں گی؟''

''امی تو اذان کے وقت ہی اٹھ جاتی ہیں۔ ابھی قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ پھر پہلے احمد اور احسن کو ناشتا کرائیں گی' اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔'' سحر بھی سمجھی کہ وہ ناشتے کی وجہ سے پھوپھو کا پوچھ رہی ہے جب ہی ان کا پورا پروگرام بتا ڈالا۔ تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہماری باری نہ بھی آئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کیوں' تم ناشتا نہیں کرتیں؟''

''کبھی کرتی ہوں' کبھی نہیں۔ ویسے جب سے یہاں آئی ہوں۔ میرا مطلب ہے شاہ پور' تو بی بی جان زبردستی کراتی ہیں۔'' اس نے کہا اور شہر بانو کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''السلام علیکم پھوپھو!''

''جیتی رہو۔ بیٹھو' کھڑی کیوں ہو گئیں۔ یا اگر ناشتا کرنا چاہو تو احمد حسن۔''

''نہیں پھوپھو! میں آپ کے ساتھ کروں گی۔'' وہ فوراً کہہ کر بیٹھ گئی۔

''اچھی بات ہے۔'' شہر بانو آگے بڑھ گئیں تو سحر اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

''سنو رات شاہ تیمور بتا رہے تھے کہ بابا جان تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''لیکن تمہاری امی اس شادی کو تو مان نہیں رہیں۔ وہ جو تمہاری بہن کی ہوئی ہے۔ رخصتی بھی نہیں کر دیں۔''

''میرا خیال ہے' میری شادی کے بعد مما صبا کی رخصتی پر آمادہ ہو جائیں گی۔'' اس نے یقین سے کہا تو سحر سادگی سے پوچھنے لگی۔

''تمہاری شادی پر آمادہ ہو گئیں؟''

''ہوں یا نہ ہوں' میں تو آمادہ ہوں۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔

سحر یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے سمجھ نہ پا رہی ہو۔

''تمہیں یہ بات عجیب کیوں لگ رہی ہے۔ میری شادی کا فیصلہ میرے دادا نے کیا ہے اور میں ان کے فیصلے سے خوش ہوں۔ جس پر مما کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر اعتراض کریں تب بھی بابا جان کے نزدیک میری خوشی زیادہ اہم ہے۔ میں شاہ پور میں رہنا چاہتی ہوں اور مجھے شاہ تیمور پسند ہیں۔''

وہ سحر کی ناسمجھی پر تعجب کا اظہار کرنے کے بعد وضاحت کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے خاموش ہو گئی اور ذرا سی گردن موڑی تھی کہ شاہ تیمور سامنے آ گیا۔ اس کے ہونٹوں میں دبی دلکش مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کی آخری بات سن چکا ہے۔ پھر بھی انجان بننے کی کوشش کرنے لگی۔ تو وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''کیا کہہ رہی تھیں' ذرا پھر سے کہو۔''

''میں اپنی بات دہرایا نہیں کرتی۔'' وہ ایک ادا سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو جا کہاں رہی ہو؟'' شاہ تیمور نے فوراً آگے آ کر اس کا راستہ روکا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''بس یہیں ڈائننگ ہال تک۔'' پھر پلٹ کر سحر سے مخاطب ہوئی۔ ''چلو سحر! ناشتا کر لیں۔''

''اچھا سنو' ناشتے کے بعد کیا پروگرام ہے؟ میرا مطلب ہے' میں رقبے پر جا رہا ہوں۔ اگر چلنا چاہو تو''

''نہیں' میں آج پھوپھو کے پاس رہوں گی۔ رات تو وہ جلدی سو گئی تھیں۔ میری ان سے زیادہ بات نہیں ہو سکی۔'' اس نے سہولت سے منع کرتے ہوئے کہا تو شاہ تیمور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم ابھی ایک دو دن یہیں رہو' بلکہ جب تک تمہارا دل چاہے۔''

"دل، ول کی بات نہ کریں۔ دل تو پتا نہیں کیا کیا چاہتا ہے۔" وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے شاہ تیمور ذرا سے کندھے اچکا کر مسکرایا پھر سحر کو اپنے جانے کا بتا کر وہیں سے باہر نکل گیا تھا۔

گو کہ شہر بانو کا رویہ اس کے ساتھ نیا نیا سا تھا۔ اس کے باوجود ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اسے گھیر کر بیٹھ گئی اور کچھ دیر تک یوں ہی ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، ساتھ لگاوٹ کا مظاہرہ بھی کیا۔ جس سے شہر بانو کی سرد مہری ٹوٹنے لگی تھی۔ وقفے وقفے سے بے اختیار ہو کر کبھی اس کا گال چھوتی، کبھی پیار سے ہاتھ ہاتھوں میں لے لیتی اور آخر زبان سے بھی اظہار کر دیا۔

"تم بہت پیاری بچی ہو۔ اگر بابا جان تمہیں تیمور کے ساتھ منسوب نہ کر چکے ہوتے تو میں تمہیں ولید کے لیے اپنے پاس لے آتی۔"

"پھپھو!" وہ ان کا مطلب سمجھ کر شرما گئی تو شہر بانو نے اسے گلے لگا کر پیار کیا پھر پوچھنے لگی۔

"تم خوش ہو نا؟"

"جی لیکن مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔" اس نے اپنے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"کیوں، ڈر کیوں لگ رہا ہے۔ تیمور ماشاء اللہ بہت اچھا' بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔"

"ہاں لیکن۔" وہ ہچکچا گئی۔

"لیکن کیا؟ کہو بیٹی! جو بھی بات ہے کہہ ڈالو۔ کیوں ڈرتی ہو؟" شہر بانو نے بہت اپنائیت سے کہا۔

"کیا بتاؤں پھپھو! اصل میں امی کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ کہتی تھیں، اگر ہم شاہ پور گئے تو ہمارے ساتھ بھی۔ بس میں یہی سوچ کر ڈر رہی ہوں۔" اس نے رک رک کر اپنے ڈرنے کا سبب بتایا تو شہر بانو فوراً بولی تھیں۔

"ارے نہیں بیٹا! تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوگا؟ تم اور صبا تو اس گھر کی بیٹیاں ہو اور اپنی بیٹیوں کے لیے بابا جان کے بڑے سخت اصول ہیں۔"

"جی، میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں بیاہتے۔"

"یہ حقیقت ہے اور جو کچھ تمہاری ماں نے تم سے کہا۔ اس پر میں یہی کہوں گی کہ وہ عورت اپنی جگہ ٹھیک ہے اس کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس کے بعد وہ تمہارے سامنے شاہ پور والوں کی کوئی اچھی تصویر تو پیش نہیں کر سکتی تھی۔ یقیناً اس نے تمہیں ڈرایا ہوگا۔ اس لیے تمہارے اندر خوف ہے۔" شہر بانو نے کچھ غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

"جی اور بے بنیاد تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ بابا بھی تو بہت اچھے' بہت محبت کرنے والے انسان ہیں پھر بھی انہوں نے مما کو طلاق دے دی تھی۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بابا جان تمہاری ماں کو طلاق نہ دلواتے تو یہاں وہ گھر برباد ہو جاتے۔"

شہر بانو کے ایک ہی جملے سے ان ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی جو اسے شاہ تیمور نے بتائی تھیں۔

"ہاں۔" اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی۔

"میری بات سمجھ گئی ہو نا۔ علی اور تیمور کے ساتھ وہ مسئلہ نہیں ہے جو تمہارے باپ کے ساتھ تھا۔ بابا جان کو جتنی محنت تمہارے باپ کو واپس لانے میں کرنی پڑی تھی' اس سے زیادہ تمہارے اور صبا کے حصول کے لیے کرنی پڑ رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ کہیں شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہ چلی جائیں۔ تم اپنے دل میں سے سارے ڈر،

ہمارے خوف نکال دو۔ تمہارے اور صبا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ بہت خوش رہو گی تم یہاں۔"

"میں ابھی بھی بہت خوش ہوں۔" اس نے خوشی کا اظہار شہر بانو کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

ٹھیک دسویں دن شاہ سکندر کی واپسی ہوئی تھی اور اپنے استقبال کے لیے آنے والوں میں علی جہانگیر کو دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکے تھے۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی البتہ اس کے چہرے پر سنجیدگی غیر معمولی تھی۔ جو انہوں نے پہلی نظر میں ہی محسوس کی اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سب خیریت ہے نا؟"

"جی!" اس وقت وہ یہی جواب دے سکتا تھا' پھر فوراً پوچھنے لگا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"دو تین روز کے لیے شاہ پور جاؤں گا' اس کے بعد۔"

"نہیں چچا جان!" وہ فوراً بول پڑا۔ "آج آپ میرے مہمان ہوں گے۔ میں اسپیشلی۔۔۔ آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"کوئی خاص بات؟" انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"جی!" علی جہانگیر نے جی کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے تو انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ اسے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکلے اور پھر پہلے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا، اس کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھے تھے۔

تمام راستہ انہوں نے قصداً کچھ پوچھنے سے گریز کیا تھا اور گھر آ کر علی جہانگیر یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لیں، اس کے بعد بات کرے گا۔ اس لیے انہیں خاص ان کے لیے مخصوص کیے گئے بیڈ روم میں چھوڑ کر خود چائے کا کہنے کے بہانے نکل گیا تھا۔

شاہ سکندر ایک سگار پینے تک بیٹھے پھر شاور لینے کے ارادے سے واش روم کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ شاور لے کر نکلے تو کرم دین چائے کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"علی کہاں ہے؟"

"جی اپنے کمرے میں۔"

"وہاں کیا کر رہا ہے۔ بھیجو اسے میرے پاس۔" وہ اب مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے قدرے درشت لہجے میں کہا تو کرم دین فوراً چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی علی جہانگیر آ گیا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟" انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کہیں نہیں تھا چچا جان!" علی جہانگیر ان کے پاس آ بیٹھا اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ ان کے سامنے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔"

انہوں نے چائے کا کپ رکھ کر لفافے میں سے پیپرز نکالے اور پھر تحریر پر نظریں دوڑاتے ہوئے ان کی پیشانی پر شکنوں کا جال بنتا گیا تھا۔

علی جہانگیر بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ان کے ہونٹ بھینچنے پر کہنے لگا۔

"میں ایسا نہیں چاہتا پاپا جان! اور صباحت بھی نہیں چاہتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس اقدام کے لیے اسے مجبور کیا گیا ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"میری محبت۔" وہ کہہ کر ہونٹ بھینچ گیا۔

شاہ سکندر چونک کر دیکھنے لگے تو قدرے توقف سے مزید گویا ہوا۔

"آپ چاہیں تو صباحت سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں کسی پلاننگ کے تحت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اس وقت ایک دوسرے کو پسند کیا جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور تب میرا خیال تھا، مجھے بھی آپ کی طرح سب کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ پاپا جان نے پہلی ملاقات میں ہی جان لیا تھا کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"پاپا جان نے۔" وہ کسی طرح اپنی حیرت نہیں چھپا سکے۔ "وہ کب، کہاں ملے تھے صباحت سے؟"

"یہیں اسی گھر میں۔ اتفاق سے جس روز وہ آئی تھی پاپا جان یہیں موجود تھے اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔"

وہ پوری تفصیل بتا رہا تھا اور شاہ سکندر کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔ جب پاپا جان نے ایک دن اچانک انہیں بلا کر پوچھا تھا کہ ڈاکٹر آسیہ کے پاس ان کی کوئی اولاد ہے اور اگر ہے تو اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ اس وقت وہ کتنے انجان بن گئے تھے کہ پتا نہیں آسیہ کے پاس اس کا بیٹا ہے یا بیٹی۔ جبکہ پاپا جان جانتے تھے اور باقاعدہ اسے لانے کا پلان بھی بنا چکے تھے۔

"آپ کیا سوچنے لگے چاچا جان؟ میرا یقین کریں' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں صباحت کے ساتھ اتنا مخلص ہوں، جتنا اپنے آپ کے ساتھ۔" علی جہانگیر نے عاجزی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" انہوں نے اسی سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر سگار اٹھا لیا اور اسے سلگانے کے بعد ایک نظر علی جہانگیر کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں' آپ ایک بار ڈاکٹر آسیہ سے ملیں۔ انہیں بتائیں کہ صباحت اور میں..." وہ روانی سے بولتا ہوا ایک دم خاموش ہو گیا۔

"اس سے پہلے میں صباحت سے بات کرنا چاہوں گا۔ تمہارے پاس اس کا نمبر تو ہو گا؟" انہوں نے جیب سے چین نکالتے ہوئے پوچھا اور جو لفافہ وہ لایا تھا اس پر نمبر لکھنے کے بعد اسے جانے کا کہا تو وہ کچھ جز بز سا ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

شاہ سکندر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے موبائل پر نمبر پریس کیے تھے۔

تیسری بیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ ہیلو کی آواز آئی تھی۔

"مجھے صباحت سے بات کرنی ہے۔" انہوں نے اپنا سارا دھیان دوسری طرف رکھ کر کہا۔

"جی آپ کون؟" ادھر سے پوچھا گیا۔ آواز بالکل مدیحہ جیسی تھی۔ وہ سمجھ گئے صباحت ہی ہے۔ کیونکہ مدیحہ آپ کون کا سوال نہیں اٹھا سکتی تھی۔

"بیٹا صبا! میں ہوں شاہ سکندر حیات۔" انہوں نے بڑی محبت سے اس کا نام لے کر کہا۔

دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پتا نہیں وہ کس کیفیت میں گھر گئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے اور چند لمحے رک کر پکار کر کہنے لگے۔

"بیٹا! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ سن رہی ہو نا؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔

"صبا! خاموش مت رہو بیٹا۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔ اس وقت مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ یہ جو طلاق کا نوٹس آپ نے بھجوایا ہے۔ کیا اس میں آپ کی مرضی شامل ہے؟"

بہت ہلکی سی آواز آئی تھی۔ جیسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی کو دبا دیا گیا ہو۔

"آپ رو رہی ہو؟" انہوں نے بہت بے چین ہو کر فوراً پوچھا تھا۔

ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"مائی گاڈ!" انہوں نے موبائل آف کر دیا اور اس کے رونے کا سبب سوچنے لگے، لیکن کچھ دیر بعد ہی ان کا ذہن اس سے آگے کی سوچنے لگا اور پھر وہ اسی وقت آسیہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

شام کے سات بج رہے تھے، جب انہوں نے ڈاکٹر آسیہ کے روم کے کھلے دروازے پر ہلکے سے دستک دی تھی۔

آسیہ ایک خاتون کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ دستک کی آواز پر ادھر متوجہ ہوئی اور انہیں دیکھ کر ٹھٹکنے کے ساتھ پیشانی پر بل ڈال کر قدرے ناگواری سے بولی۔

"آپ پلیز' باہر انتظار کریں۔"

وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ آئے اور بڑے آرام سے اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ بھی گئے تو آسیہ نے تماشا بننے کے خیال سے جلدی جلدی خاتون کو چیک کر کے میڈیسن لکھ کر اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

"سسٹر! باقی مریضوں سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحبہ ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں باہر جا رہی ہیں۔ اس لیے انہیں کل دیکھیں گی۔" خاتون کے جاتے ہی شاہ سکندر نے مسسٹر کو مخاطب کر کے کہا تو وہ آسیہ کو دیکھنے لگی۔

"میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"اچھی بات ہے۔" شاہ سکندر اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور ایک نظر باہر دیکھنے کے بعد دروازہ بند کر کے آسیہ کی طرف پلٹے تو وہ بہت ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑی۔

"شاہ سکندر حیات! آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔"

"اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا وہ بہت ٹھیک تھا؟" وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کے ساتھ کیا ہوا اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز صاف لفظوں میں اپنی آمد کا مقصد بیان کریں اور۔"

وہ روانی میں بولتی ہوئی ہونٹ بھینچ گئی تو وہ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے خاموش بیٹھے رہے، پھر جیب سے لفافہ نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولے۔

"جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ صباحت کے بارے میں آپ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گی، آپ نے یہ نوٹس کیوں بھجوایا؟"

"اس لیے کہ مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی تھی۔

"اور صباحت' وہ کیا چاہتی ہے؟" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے اس کی مرضی سے۔"

"جی نہیں۔" وہ فوراً ٹوک گئے۔ "اس کی مرضی آپ کو معلوم ہی نہیں ہے ڈاکٹر آسیہ! آپ خود جو کچھ کرنا چاہتی ہیں اس پر زبردستی' محبت سے یا کسی بھی طرح اسے راضی کر لیتی ہیں۔ یہ جاننے کی آپ نے کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ اصل میں وہ کیا چاہتی ہے۔"

"معاف کیجئے گا شاہ سکندر! میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت نیک' سعادت مند اور محبت کرنے والی بچی ہے۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا اور اس معاملے میں تو اس نے شروع ہی میں سارا اختیار مجھے سونپ دیا تھا کہ میں جو چاہوں فیصلہ کروں۔" آسیہ نے صباحت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب' اس محبت کرنے والی بچی کی سعادت مندی کا یہ صلہ دیا آپ نے اسے کہ اس کے دل کی بستی اجاڑنے کا سامان کر دیا۔" وہ طنز آمیز لہجے میں بولے تھے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" آسیہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"مجھے آپ کی بے خبری پر افسوس ہے ڈاکٹر آسیہ! میرا تو خیال تھا۔ ماں ہونے کے ناطے آپ مدیحہ سے بہت قریب اور ان کی ہر بات سے آگاہ ہوں گی اور یہ بھی جانتی ہوں گی کہ صباحت اور علی جہانگیر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" انہوں نے تاسف کے اظہار کے ساتھ کہا تو آسیہ کی پیشانی کی شکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"بہر حال، میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ جو ظلم آپ نے اپنے ساتھ کیا وہ صباحت پر نہیں ہونا چاہیے۔" ان کے انداز میں وارننگ تھی۔

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔ نہیں شاہ سکندر حیات! میں زندگی میں کبھی نہیں پچھتائی اور میری بیٹی بھی نہیں پچھتائے گی۔ ابھی ہو سکتا ہے اسے دکھ ہو اور میرے اس فیصلے کو ظلم سمجھ رہی ہو لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا بلکہ آنے والے مظالم سے بچا لیا تھا۔" وہ ان کی وارننگ پر تیز ہو کر بول رہی تھی۔

"اور شاہ سکندر حیات! آپ کیوں اپنی بیٹی کے دشمن ہو رہے ہیں۔ بھتیجے کی محبت میں بیٹی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا۔"

"بس خاموش ہو جائیں آسیہ!" انہوں نے غصے سے ٹوکا تو وہ ہنوز اسی لہجے میں بولی۔

"کیوں' سچ نہیں سن سکتے۔"

"سچ ہی سننا چاہتا ہوں، سچ ہی کہنا چاہتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ میں آج بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔" جانے کون سا جذبہ اچانک غالب آ کر انہیں بے اختیار کر گیا تھا پھر فوراً ہونٹ بھینچ گئے۔

آسیہ ایک دم سناٹے میں آ گئی تھی۔

گردش دوراں یہ کس موڑ پر لے آئی تھی۔

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا

اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

کتنے لمحے بہت حیران ہو کر ان ساکت وجودوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے دل ایک ہی لے پر دھڑک رہے تھے۔ لیکن کتنے بے بس تھے دونوں کہ درمیان میں حائل خلیج عبور کرنے کا حوصلہ کر بھی لیتے تب بھی ایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا۔" کتنی دیر بعد شاہ سکندر بولنے کے قابل ہوئے تو معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"اگر کر سکیں تو ایک بار اور میرا اعتبار کر لیں۔ میرے پیش نظر پہلے بھی صباحت کی بہتری تھی اور ابھی بھی میں اس کا خیال کر کے آیا ہوں۔ آپ کی خاطر وہ علی سے ناتا توڑنے پر آمادہ تو ہو گئی ہے، لیکن اس کے بعد وہ خوش رہنا تو دور کی بات، زندہ بھی نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ وہ آپ کی طرح بہادر نہیں ہے۔ مجھے مدیحہ نے بتایا تھا کہ وہ بہت نازک دل ہے۔ ایسی صورت میں تو آپ کو اس کا اور خیال کرنا چاہیے۔ میں ابھی بھی آپ کو فورس نہیں کر رہا، بلکہ درخواست کر رہا ہوں کہ اگر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میری باتوں پر غور ضرور کیجئے گا اور بالکل غیر جانبداری سے۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تو آسیہ کے سینے سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی، پھر کچھ ناراض لہجے میں بولی تھی۔

"میں کچھ نہیں سوچ سکتی جب تک مدیحہ میرے پاس نہیں آ جاتی۔"

"مدیحہ!" وہ بری طرح چونکے لیکن خود کو مزید کچھ کہنے سے روک بھی لیا۔ جبکہ ان کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا تھا۔

"جی شاہ جہانگیر کی دھمکی کے بعد میں اس کی طرف سے بہت فکرمند ہوں اور صباحت کا فیصلہ بھی اس دھمکی کا مرہون منت ہے۔ میں کیسے اس گھر میں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں جہاں اس کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔

"میں ہوں نا ان کا باپ۔ آپ فکر نہیں کریں۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدیحہ کو لے آؤں گا۔"

انہوں نے بہت سنبھل کر اسے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے تو ان کا اپنا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ علی جہانگیر کس شدت سے ان کا انتظار کر رہا ہو گا۔ صرف مدیحہ کا خیال تھا جو وہیں سے گاڑی شاہ پور کے راستے پر ڈال دی تھی۔

❁ ❁ ❁

اس کے اندر بھی شاہ سکندر کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ لیکن اس نے کبھی مدیحہ کی طرح اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے بھی اظہار سے روکتی تھی۔ کیونکہ اسے آسیہ کا خیال تھا اور اسے دکھ دینے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے باپ سے فطری محبت کو اس نے ہمیشہ دبایا تھا اور اس کے لیے اسے زیادہ تر دو نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بس ایک سوچ ہی کافی تھی کہ اس شخص نے اس کی ماں کو دکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر تنفر بھر جاتا اور محبت جانے کن گوشے کھدروں میں جا چھپتی۔ جو اگر کبھی سر ابھارتی بھی تو اس کی بزدلی اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی تھی۔ لیکن ابھی شام میں سکندر نے فون کر کے جس محبت سے اسے مخاطب کیا تھا اس سے وہ اس بری طرح گھبرا گئی تھی کہ اس کے

بعد سے اب تک خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آنسو جو ان کی آواز سنتے ہی چھلکے تھے، اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ان پر بند باندھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ ہچکیوں کو روکنے کے لیے اس نے منہ پر تکیہ رکھ لیا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب نبیل آئے اور حسب عادت پہلے اس کے کمرے میں جھانکا تو اسے بے وقت لیٹے اور تکیے میں منہ چھپائے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے پھر پکارتے ہوئے اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔

"صبا کیا ہوا بیٹا؟"

اسے زندگی میں پہلی بار نبیل کی آمد بہت بری لگی تھی۔ دل چاہا سارے لحاظ بھلا کر انہیں چلے جانے کا کہہ دے۔ بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

"تم رو رہی ہو؟" نبیل نے آہستہ سے اس کے منہ پر سے تکیہ ہٹایا اور جل تھل کا سماں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

"صبا کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس طرح رو رہی ہو؟" انہوں نے پہلے نرمی سے پوچھا پھر اسے جھنجھوڑ ڈالا تو وہ چیخ کر بولی۔

"میری مرضی، میرا دل چاہ رہا ہے رونے کو۔ اور اس سے آپ کا کیا بگڑ رہا ہے؟ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"یہی تو مشکل ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ اس کے چیخنے پر حیران ہوتے ہوئے بولے تھے۔

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ جائیں۔" وہ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف کرتے ہوئے بولی۔

"آرام سے۔" ان کی ذرا سی ہنسی میں دکھ تھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ "چلو منہ دھو کر آؤ۔ پھوپھو آنے والی ہوں گی۔"

"تو آیا کریں، ان کے سامنے کیا میں نہیں رو سکتی۔"

"کوئی وجہ بھی ہو رونے کی۔"

"ضروری نہیں ہے۔ بس میرا دل چاہ رہا ہے اور آپ پلیز مجھے منع نہیں کریں۔" اس نے پھر لیٹ کر تکیہ منہ پر رکھ لیا تو نبیل الجھ گئے کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو وہ ان سے چھپا رہی ہے۔ گو انہیں یقین تھا کہ کوئی بات ہوئی ضرور ہے۔ کچھ دیر تک قیاس کرتے رہے۔ زیادہ گمان یہی تھا کہ علی جہانگیر کا فون آیا ہو گا اور اس نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے وہ ہرٹ ہوئی ہے یا پریشان ہو کر رو رہی ہے۔ اور یہ طے تھا کہ اس وقت وہ کچھ نہیں بتائے گی۔ اس لیے انہوں نے مزید اصرار کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے مخاطب کر کے بولے۔

"ٹھیک ہے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں لیکن آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اس لیے جب رونے سے دل بھر جائے تو میرے آرام سے سونے کا خیال کر لینا۔" اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس کے کمرے سے نکل گئے۔

"ہرگز نہیں۔ اب میں کسی کا خیال نہیں کروں گی۔ مما کا بھی نہیں۔"

وہ جو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوئی تھی سب سے ناراض ہو کر سوچنے لگی تھی۔ بے سروپا سوچیں جو اسے ہر احساس سے عاری کر رہی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی ایک احساس بیدار ہوتا نیند نے اسے اپنے آپ سے

بھی غافل کر دیا تھا۔

جبکہ ادھر نبیل اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح کچھ دیر میں ہی وہ ان کے پیچھے بھاگی آئے گی اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں اپنے رونے کا سبب بتا کر کہے گی۔ آپ بہت خراب ہیں نبیل بھائی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر نہیں بہت دیر ہو گئی۔ تب نبیل تشویش میں مبتلا ہو گئے اور کسی طرح رہا نہیں گیا تو پھر اس کے کمرے میں آ گئے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ آواز میں ایک دو بار پکارا کہ شاید کچی نیند سے بیدار ہو جائے، لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تب اس کے پاس بیٹھتے ہوئے انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے اور گالوں پر لکیریں سی بن گئی تھیں۔

"یہ رونا بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔"

انہیں حقیقتاً بہت دکھ ہو رہا تھا۔ بہت احتیاط سے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر اٹھتے ہوئے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔ اس سارے جہاں میں ایک وہی تو تھی جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ شیئر کرتے تھے اور اس کی ذرا سی تکلیف انہیں اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے رہے پھر لابی میں آ کر علی جہانگیر کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

ادھر سے پہلی بیل کے ساتھ ہی جس طرح ریسیور اٹھایا گیا اس سے یہی لگا جیسے وہ فون کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"میں ہوں نبیل۔" انہوں نے اس کی ہیلو کے جواب میں کہا تو اس بار اس کا انداز مایوسی لیے ہوئے تھا۔

"جی فرمائیے۔"

"مجھے یہ پوچھنا ہے کہ شام میں آپ کی صباحت سے کیا بات ہوئی تھی؟" انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اور بڑے یقین سے پوچھا۔

"میری۔" علی جہانگیر کی حیرت بھری آواز پر وہ زور دے کر بولے۔

"جی آپ کی۔"

"جی نہیں، میری صباحت سے بات نہیں ہوئی۔ البتہ چچا جان نے فون کیا تھا۔"

"چچا جان؟"

"شاہ سکندر حیات، کیوں خیریت؟" علی جہانگیر نے نام بتا کر فوراً پوچھا۔ لیکن وہ شاہ سکندر کا نام سنتے ہی ایک دم خاموش ہو گئے اور فون بھی رکھ دیا۔ کیونکہ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صباحت کا رونا ان کی سمجھ میں آ گیا تھا اور اس کا سبب جاننا بھی حیرت انگیز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ دو سال پہلے طویل مدت بعد جب وہ اپنی ماں سے ملے تھے تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی اور انہوں نے تو ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شام میں ٹیوشن کے بعد اکثر اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان کے دو بہن بھائی اور بھی ہیں۔ جو ان سے اسی طرح ملتے ہیں۔ جیسے پاپا کی اولاد ہیں۔ سمیر، رجا اور مریم۔

"کتنے چاہنے والے ہیں ہمارے پھر بھی ہم اکیلے ہیں۔" انہوں نے صباحت کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر اپنے کمرے میں آ کر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔

* — * — *

شاہ سکندر رات بارہ بجے کے بعد شاہ ولا پہنچے تھے اور بابا جان کے آرام کا خیال کیے بغیر اسی وقت

سیدھے ان کے کمرے میں چلے آئے۔ زیرو پاور کی مدھم روشنی میں بابا جان پتا نہیں سو رہے تھے یا یوں ہی آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

"بابا جان!" سکندر نے انہیں پکارنے کے ساتھ ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کر دیا۔

بابا جان نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور انہیں دیکھ کر تکیے سے سر اونچا کرتے ہوئے بولے۔

"تم سکندر! ابھی آ رہے ہو؟"

"مدیحہ کہاں ہے؟" شاہ سکندر نے ان کی بات یکسر ان سنی کر کے پوچھا۔ ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں جیسے کوئی طوفان چھپا تھا۔

بابا جان ایک لمحہ کو ٹھٹکے پھر فوراً انجان بن گئے۔

"کون؟"

"مدیحہ میری بیٹی۔ کہاں چھپا دیا ہے آپ نے اسے اور کیوں؟" شاہ سکندر کسی طرح ضبط نہیں کر پا رہے تھے۔

"آرام سے، آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔" بابا جان نے انہیں پرسکون کرنے کی سعی کی۔

"میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا بابا جان! جب تک مجھے مدیحہ نہیں مل جاتی۔ آپ بتائیں، کہاں ہے وہ؟"

"ہم کیا بتائیں۔ ہم تو اسے کراچی چھوڑ کر آئے تھے۔ تم کراچی والوں سے معلوم کرو۔ وہ یقیناً پھر تمہیں دھوکا دے رہے ہیں۔ جیسے پہلے انہوں نے تم سے تمہاری بیٹی کو چھپایا تھا۔"

بابا جان نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا کہ کچھ دیر کو وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بات میں واقعی صداقت تھی۔ آسیہ نے انہیں ایک بیٹی کا بتایا تھا۔

"میں کراچی ہی سے آ رہا ہوں بابا جان! اور مجھے وہیں سے معلوم ہوا ہے کہ مدیحہ وہاں نہیں پہنچی۔" اس بار شاہ سکندر کا لہجہ کمزور تھا۔

"کیسے نہیں پہنچی۔ ہم خود اسے اس کے دروازے پر چھوڑ کر آئے تھے۔"

بابا جان اپنی بات پر قائم رہ کر تیز لہجے میں بولے۔ "معلوم کرو اس ڈاکٹرنی سے کہ اب وہ ہم سے اور کیا چاہتی ہے؟ ہم اپنی پوتیوں کے صدقے میں اسے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔"

شاہ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کا یقین کریں۔ آسیہ کا یا بابا جان کا۔ ان دونوں کے درمیان وہ خود کو انتہائی احمق لگنے لگے تھے۔

"بیٹا! تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ مدیحہ اپنی ماں کے پاس ہے اور اس کی ماں بہت شاطر عورت ہے۔ اس کی چالیں تم نہیں سمجھ سکتے۔ جانتے ہو، صباحت کی طرف سے وہ خلع کا دعوا دائر کر چکی ہے۔"

بابا جان ان سے ہمدردی جتا کر آسیہ کے خلاف بولنا شروع ہو گئے تھے۔

"جی مجھے علی نے بتایا ہے اور میں اس سلسلے میں آسیہ کے پاس گیا تھا۔ تاکہ اسے نوٹس واپس لینے پر مجبور کر سکوں۔" ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے شاہ سکندر نے رک کر بتایا تو بابا جان نے فوراً پوچھا۔

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"اس کا کہنا ہے، جب تک مدیحہ اس کے پاس نہیں پہنچ جاتی وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔"

"دیکھ لو اس کی چالاکی۔"

"اگر مدیحہ اس کی چالاکی ہے تو بہت مہنگی پڑے گی اسے۔" شاہ سکندر نے انتہائی تنفر سے کہا اور ایک نظر بابا جان کو دیکھ کر ان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

پھر مہر النساء کی نیند خراب ہونے کے خیال سے وہ بیڈ روم میں جانے کی بجائے اپنے اسٹڈی روم میں آ گئے۔ پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا۔ گلے سے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈالی پھر سگار سلگا کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ ان کا دماغ بری طرح چیخ رہا تھا۔ کیونکہ بابا جان اور آسیہ دونوں کی باتیں ایک ساتھ ان کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھیں اور اس میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان دونوں میں سے کون سچا ہے؟ اور کوئی بھی ہو انہیں مدیحہ کا پتا چلنا چاہیے۔

"کس سے معلوم کروں؟" انہوں نے سلگتے ذہن کے ساتھ سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں سب سو رہے تھے لیکن کراچی میں تو اس وقت رات شروع ہوتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھے اور اپنا موبائل اٹھا کر آن کیا تھا کہ وہ بجنے لگی۔ غالباً کوئی مسلسل ٹرائی کر رہا تھا۔

"ہیلو!" انہوں نے بہت بے دلی سے ہیلو کہا تھا۔

"چچا جان! کہاں ہیں آپ؟" دوسری طرف علی جہانگیر تھا۔ ان کی آواز سن کر جیسے اس کی جان میں جان آئی تھی۔

"سوری بیٹا! میں بالکل بھول گیا کہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔ ویری سوری۔" انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ اسے کس انتظار میں چھوڑ آئے تھے۔ بہت معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"اصل میں بات ہی ایسی ہو گئی تھی کہ میں وہاں رک نہیں سکا اور سیدھا شاہ پور چلا آیا۔"

"ک... کیا بات؟" وہ غالباً اپنے متعلق سوچ کر پریشان ہوا تھا۔

"وہ بیٹا! مدیحہ کا معلوم کرنا تھا کہ کہاں ہے وہ؟" انہوں نے قصداً سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"رتجے پر۔"

"کہاں؟" وہ ایک دم پوری جان سے متوجہ ہوئے تھے۔

"رتجے پر چچا جان! جہاں تایا جی کا کاٹیج ہے۔ جس روز آپ کینیڈا جا رہے تھے اس روز میں نے اسے وہیں دیکھا تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ اسے وہ جگہ بہت پسند آئی ہے اور وہ وہیں رہے گی۔ میرا خیال ہے اس کی خواہش کو دیکھتے ہوئے بابا جان نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ بابا جان سے معلوم کر لیں۔"

علی جہانگیر نے تفصیل بتانے کے ساتھ مشورہ بھی دیا تو وہ چونک کر بولے۔

"ہاں، ابھی تو بابا جان سو رہے ہیں۔ صبح معلوم کروں گا اور سنو تم صبح جتنی جلدی ممکن ہو سکے رتجے پر پہنچ جانا۔ میں باقی باتیں تم سے وہیں کروں گا۔"

"جی بہتر۔"

"خدا حافظ۔" انہوں نے موبائل بند کر دیا اور دل تو چاہا اسی وقت جا کر بابا جان کو جھنجوڑ ڈالیں لیکن ان کی شاطرانہ چالوں کا سوچ کر انہیں ضبط کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سوچ لیا کہ جب تک مدیحہ کو حاصل نہیں کر لیتے بابا جان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ان سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے وہ مدیحہ کی جان بھی لے سکتے تھے۔ بہر حال انہیں مدیحہ کا پتا چل گیا تھا اس کے بعد اپنا اگلا اقدام سوچ کر وہ کافی حد تک مطمئن بھی

ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود تمام رات سو نہیں سکے اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی حویلی سے نکل آئے تھے۔
مسلسل ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب وہ کالج پہنچے۔ سورج نکل آیا تھا۔ سرخ بجری کی روش پر گاڑی روک کر وہ نیچے اترے تو چوکیدار دور سے بھاگا آیا۔

"سلام صاحب!"

وہ سر کے اشارے سے جواب دیتے تیز قدموں سے آگے چل پڑے۔ کالج کا گیٹ کھلا تھا۔ دور کے بھی اندر چلے آئے۔ کوریڈور اور پھر ہال میں کوئی نہیں تھا۔ نہ کسی کی موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے پھر بھی انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا۔

"مدیحہ!" خاموشی میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔

"بی بی یہاں نہیں ہیں صاحب!" عقب سے چوکیدار نے کہا تو وہ فوراً اس کی طرف پلٹے۔

"پھر کہاں ہے؟"

"پتا نہیں صاحب! مجھے بتا کر تو نہیں گئیں۔" چوکیدار ان کے جارحانہ انداز سے خائف ہو کر بولا۔

"بتا کر نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے یہاں آئی تھی۔" انہوں نے پرسوچ انداز میں خود کلامی کی پھر چوکیدار کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"یہاں سے کب گئی ہیں؟"

"چار پانچ روز ہو گئے ہیں۔"

"کون لے گیا تھا اسے؟"

"شاہ تیمور۔"

"یہاں کتنے دن رہی تھی؟"

"پہلے وقت بی دو دن رہیں پھر چلی گئیں پھر آئیں تو چار دن رہیں اور جاتے ہوئے پھر آنے کا بھی کہہ گئی ہیں۔" چوکیدار نے باقاعدہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا۔

"کب؟"

"یہ تو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا آج آ جائیں یا کل۔ آپ شاہ تیمور سے معلوم کر لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور کوئی ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔"

وہ چوکیدار کو بھیج کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اب اس مقام پر ان کا ذہن حریف کچھ نہیں سوچ پا رہا تھا۔ رات بھر جاگنے نے انہیں اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا ناکامی نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد چوکیدار نے ناشتا لا کر ان کے سامنے رکھا تو اس وقت علی جہانگیر بھی آ گیا۔

"السلام علیکم چچا جان!"

انہوں نے علی جہانگیر کی آواز پر ہاتھوں سے سر اونچا کیا تھا اور اسے دیکھ کر انہیں کافی حوصلہ ہوا۔

"بیٹھو بیٹا! وقت پر آ گئے۔"

"کیا بات ہے چچا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" علی جہانگیر نے ان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

"بس ٹھیک ہوں۔ بیٹا! دعا کرو آگے سب ٹھیک ہو جائے۔" انہوں نے چوکیدار کو جانے کا اشارہ کرتے

ہوئے کہا پھر چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"مدیحہ کہاں ہے؟" علی جہانگیر کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔

"اسی کی تلاش میں تو آیا ہوں۔ پتا نہیں تیمور اسے کہاں لے گیا ہے؟ ادھر میں آسیہ سے وعدہ کر آیا ہوں کہ آج ہر صورت مدیحہ کو اس کے پاس لے کر آؤں گا۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں تلاش کروں اسے؟"

"آپ بابا جان سے۔"

"نام مت لو ان کا۔ سب کیا دھرا ان ہی کا ہے۔" ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

علی جہانگیر حیران اور قدرے خائف بھی ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد خود پر قابو پا کر شاہ سکندر نے ساری باتیں تفصیل سے بتا ڈالیں۔ جنہیں سن کر وہ واقعی چکرا گیا تھا۔ لیکن ان کی خاطر خود کو سنبھال کر بولا۔

"آپ فکر نہیں کریں چچا جان! مدیحہ کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"بیٹا! جب تک وہ بابا جان کے قبضے میں ہے۔ میں اس کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرو تم ابھی شاہ پور جاؤ اور اپنے طور پر بابا جان سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مدیحہ کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا ہے اور ہاں اس سے پہلے انہیں یہ بتا دینا کہ رقیہ پر تمہاری مدیحہ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ جبکہ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سمجھ رہے ہو ناں؟"

"جی!" علی جہانگیر سمجھ کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"گڈ۔ اب تم جاؤ۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپک کر اٹھا دیا تھا۔

❁ ❁ ❁

"یہ کون سی جگہ ہے؟" مدیحہ نے سڑکوں پر اچھی خاصی رونق دیکھ کر پوچھا تو شاہ تیمور نے کچھ بے دھیانی میں جواب دیا تھا۔

"حیدر آباد۔"

"یہ حیدر آباد ہے۔" وہ اشتیاق سے بولی تو اس بار وہ متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔

"کیوں تمہیں حیدر آباد دیکھنے کا شوق تھا؟"

"نہیں۔"

"میں نے سوچا آج تمہیں شاپنگ کرا دوں۔" شاہ تیمور نے شاہانہ انداز سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"یہاں سے۔"

"ارے کیا سمجھتی ہو؟ جو رونق اور کوالٹی یہاں ہے کہیں نہیں ملے گی۔" وہ گاڑی بند کرتے ہوئے بولا۔

"چلیں دیکھ لیتے ہیں۔" وہ احسان کرتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری تو سامنے کھڑی بس کے پاس کھڑا آدمی چلا رہا تھا۔

"کراچی، کراچی، کراچی۔"

"چلو!" شاہ تیمور چکر کاٹ کر اس کے پاس آ کر بولا تو چونک کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن اس کا دھیان ابھی بھی پیچھے کی طرف تھا۔

✿ ✿ ✿

اس کے قدموں کی رفتار بہت سست تھی۔ شاہ تیمور نے ٹوکا تب وہ سر جھٹک کر تیز تیز چل پڑی۔

پھر کتنی دکانوں پر رک کر شاہ تیمور نے اپنی پسند سے اس کے لیے سوٹ خریدے۔ وہ کہیں دلچسپی ظاہر کرتی، کہیں چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آخر اسے اکتاہٹ ہونے لگی تو مزید آگے چلنے سے انکار کر دیا۔

"بس تیمور! میں تھک گئی ہوں۔"

"ارے اتنی جلدی ان کے ساتھ میچنگ شوز اور جیولری نہیں لوگی؟" شاہ تیمور نے دوسری چیزوں کے نام لے کر اسے مزید چلنے کے لیے اکسانا چاہا لیکن وہ منہ بنا کر بولی۔

"پھر سہی۔"

"شوز لے لو جیولری پھر سہی۔ چلو مجھے بھی جوگرز لینے ہیں۔" شاہ تیمور نے کہا اور اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر چل پڑا۔ تو اسے ناچار اس کی تقلید کرنی پڑی۔

پھر شوز اور سینڈل وغیرہ دیکھنے کے لیے وہ شوکیس کے پاس ہی رک گئی تھی۔

شاہ تیمور دکان کے اندر داخل ہو گیا اور سیلز مین جوگرز دکھانے کا کہہ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔

سیلز مین فوراً حرکت میں آ گیا اور ایک کے بعد ایک ڈبہ کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگا۔

اس نے باری باری سب میں پیر ڈال کر دیکھا پھر جو پسند آیا' اسے پیک کرنے کا کہہ کر مدیحہ کی طرف دیکھا لیکن وہ شوکیس کے پاس موجود نہیں تھی اس نے اپنے اطراف نظر ڈالی پھر دکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر آ کر منیجر کو مخاطب کیا۔

"ایکسکیوزمی۔ یہاں ایک لڑکی شوز دیکھ رہی تھی۔ کچھ پتا سکیں گے کس طرف گئی ہے؟"

منیجر نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"کہاں چلی گئی؟" اس نے سوچتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا جہاں کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ پھر وہ ایک ایک دکان پر جھانکتا ہوا مارکیٹ سے نکلا تو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ اسے کھو چکا ہے اور اس خیال نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ بابا جان کے سامنے جواب دہی سے زیادہ اسے اپنا خیال تھا کہ وہ سچ مچ اسے چاہنے لگا تھا۔

"نہیں وہ کہیں نہیں جا سکتی اور جائے گی کہاں، کسی دکان میں کھڑی ہو گی۔"

وہ خود کو تسلی دیتا ہوا وہ بارہ مارکیٹ کے اندر گیا اور پھر ایک ایک دکان دیکھ ڈالی۔ لیکن وہ کہیں نہیں ملی تو اس بار واپس آتے ہوئے اس کی پریشانی میں غصہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اسے چکر دے گئی تھی اور محبت کا فریب دے کر۔

"فریب نہیں نہیں۔" اس کا دل مانے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ یقیناً تنگ کرنے کے لیے کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ ٹریفک میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آیا اور جو شاپرز ہاتھ میں تھے اور رکھنے کے لیے پچھلا دروازہ کھولا تو ٹھٹک گیا، وہاں وہ سارے شاپرز رکھے تھے جو مدیحہ کے ہاتھ میں تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ یا تو یہیں کہیں موجود ہے یا اس کی چیزیں واپس کر کے گئی ہے۔ ایک مبہم سی امید کے سہارے وہ کتنی دیر گاڑی کے پاس کھڑا رہا۔ شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ تب بہت مایوس ہو کر وہ گاڑی میں بیٹھا اور وہیں سے شاہ پور چل پڑا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ حویلی پہنچا تو سیدھا بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔

"السلام علیکم بابا جان!" اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ تو بابا جان یوں چونکے

جیسے اس کی آمد غیر متوقع ہو۔ پھر فوراً سامنے صوفے کی طرف اشارا کرتے ہوئے بولے۔

آؤ تیمور! ابھی علی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔"

"علی۔" وہ ادھر متوجہ ہوا تو علی جہانگیر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کہاں ہوتے ہو یار! کیا کالج میں مستقل ڈیرہ بنا لیا ہے؟"

"نہیں' میں بابا جان کے کام سے حیدر آباد گیا تھا۔ ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔" اس نے علی جہانگیر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر کہا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھا تو پوچھنے لگا۔ "تم کب آئے؟"

"ابھی، آدھا گھنٹہ ہوا ہے اور بس ابھی جانے ہی والا تھا۔"

"یہ تمہارا ابھی آنا ابھی جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"سرکاری ملازم ہوں۔ اپنا کام بس ایسے ہی چلتا ہے۔" علی جہانگیر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا بابا جان! میں ذرا امی اور ابا جان سے مل لوں۔"

"ہاں جاؤ۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہو گی۔" بابا جان نے کہا۔

علی جہانگیر نے جاتے جاتے شاہ تیمور کو اشارہ کیا کہ وہ بابا جان سے فارغ ہو کر اس کے پاس آئے۔

شاہ تیمور نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے جانے کے بعد بابا جان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"بابا جان! وہ مدیحہ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔"

"کیا۔۔۔؟" بابا جان تکیے کا سہارا چھوڑ کر یکدم سیدھے ہوئے "کیا کہا تم نے' کہاں چلی گئی؟"

"مجھے نہیں معلوم کہاں چلی گئی۔ بس کچھ دیر کو میری توجہ اس کی طرف سے ہٹی تھی اور اتنی ہی دیر میں وہ جانے۔" شاہ تیمور کے انداز میں حد درجہ پچھتاوا تھا۔

"کہاں شہر بانو کے گھر سے؟" بابا جان نے پوچھا تو وہ کتنی دیر نفی میں سر ہلانے کے بعد بولا تھا۔

"نہیں میں آج اسے حیدر آباد لے گیا تھا۔ کچھ اپنی چیزیں لینی تھیں کچھ اس کے لیے' بس وہیں سے لگتا ہے جیسے وہ موقعے کی تلاش میں تھی پھر میں نے بہت ڈھونڈا اسے۔ کہیں نہیں ملی۔"

"اور تم آ گئے۔" بابا جان کے لہجے میں ایسی چبھن تھی کہ وہ تلملا گیا۔

"کیا کرتا ساری زندگی وہیں کھڑا رہتا؟ میں یہ بھی کر سکتا تھا اگر جو وہ خود سے نہ گئی ہوتی۔ اور مجھے اس کے جانے کا افسوس نہیں ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔"

"ہونہہ!" بابا جان نے اس کا مطلب سمجھ کر نخوت سے سر جھٹکا پھر اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بولے۔

"وہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ ادھر سکندر الگ ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم پہلے ہی اس سے کہہ چکے ہیں کہ وہ کراچی چلی گئی اور سنو۔"

بابا جان ایک دم رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"علی! تم سے مدیحہ کے بارے میں ضرور پوچھے گا' اسے یہی بتانا کہ وہ آٹھ دس دن پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ہم چھوڑ کر آئے تھے اسے سمجھے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اثبات میں سر ہلایا تو بابا جان غصے میں بولے۔

"سناتم نے ہم نے کیا کہا؟"

"جی!" اس نے بادل نخواستہ جی کی آواز نکالی تھی پھر اٹھ کھڑا ہوا تو بابا جان نے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

"خبردار علی کے سامنے چھ اگل مت دینا۔ ہمیں اس وقت اس کی آمد خاصی مشکوک لگ رہی ہے۔"

"کچھ عرصے بعد میری آمد بھی مشکوک لگے گی۔" وہ سوچتا ہوا ان کے کمرے سے نکل آیا۔

علی جہانگیر پتا نہیں کہاں تھا۔ اس نے لاؤنج میں رک کر جیراں سے پوچھا اور اس کے لاعلمی ظاہر کرنے پر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ خود اس کا اس وقت کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ علی جہانگیر ضرور اس کے پاس آئے گا' اس لیے اس سے ہر قسم کی بات کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگا تھا۔

✿ ✿ ✿

وہ کیونکہ بے حد خوفزدہ تھی، اس لیے مٹھی میں جتنے پیسے تھے رکشہ والے کو تھما دیئے اور بھاگ کر گیٹ پار کر آئی۔ آنگن اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے کسی کو پکارا بھی نہیں اور اس طرح بھاگتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آئی تو لابی سے نکلتے نبیل کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ان کے سینے سے جا لگی اور ایسے ہی بے اختیار اس کے آنسو چھلکے تھے۔ جبکہ پورا وجود پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"مدحو!" نبیل کو اس اچانک اور غیر متوقع صورتحال نے گنگ کر دیا تھا۔ بہت آہستہ سے اس کی کمر میں بازو حمائل کر کے اسے اپنی پناہوں میں تو لے لیا پھر بھی غیر یقین سے تھے۔

"نبیل بھائی! مجھے چھپا لیں، مجھے چھپا لیں نبیل بھائی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا ہوگا۔" وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"کون؟ کوئی نہیں آئے گا۔" نبیل مکمل طور پر ان لمحوں کی گرفت میں تھے۔ جانے کیسے یہ چند لفظ کہہ گئے۔

"آپ نہیں جانتے انہیں۔ بس آپ سارے دروازے بند کر دیں۔" وہ ان کے بازوؤں میں مچل کر چیخی تو اس کی آواز سن کر صباحت اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"کون ہے نبیل بھائی؟" پھر ایک دم ٹھٹک کر دیکھنے لگی تو نبیل جیسے ہوش میں آ گئے۔ فوراً اسے کندھوں سے تھام کر خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔

"مدحو ہے۔"

"مدحو!" صباحت بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ "کیا ہوا مدحو! تم رو کیوں رہی ہو؟"

"یہ سوال جواب بعد میں کرنا' پہلے اسے کمرے میں لے جاؤ۔" نبیل نے صباحت کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"آپ، آپ کہاں جا رہے ہیں؟"۔ اس نے صباحت کو چھوڑ کر نبیل کا بازو تھام لیا۔

"کہیں نہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ؟" نبیل اس کا ہاتھ تھام کر صباحت کے کمرے میں لے آئے اور اس کے ساتھ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولے۔

"صبا! جاؤ پانی بلکہ گلوکوز بنا کر لے آؤ۔"

صباحت الٹے قدموں واپس پلٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں گلوکوز لے کر آ گئی تو نبیل نے گلاس لے کر مدحیہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی۔ پھر باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔

"میں بچ بچ گھر آ گئی ہوں۔ صبا! نبیل بھائی' میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ناں۔"

"اف مدحو! تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو اور تم آئی کس کے ساتھ ہو؟" صباحت حسب عادت پریشان بھی تھی اور فوراً ساری باتیں جان بھی لینا چاہتی تھی اور جانتا تو نبیل بھی چاہتے تھے لیکن اس کی حالت کے پیش نظر بہت تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور صباحت کو بھی ایک بار پھر ٹوک دیا۔

"تم صبر نہیں کر سکتیں۔ ذرا آرام کرنے دو اسے۔"

"ہاں' میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے کہا تو نبیل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لیٹ جاؤ لیکن سونا نہیں۔ میرا مطلب ہے کھانا کھا کر سونا۔"

"مما کب آئیں گی تین تو بج رہے ہیں۔" اس نے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"مما آج دیر سے آنے کا کہہ گئی ہیں۔ کہو تو فون کر دوں۔"

"نہیں' انہیں پریشان مت کرو۔" اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی اور بے حد خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"میں مما کو فون کرتی ہوں۔" صباحت نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو نبیل اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔

"سنو تم تو بہت بہادر ہو۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے اور پھر اب تو تم اپنے گھر میں ہو۔"

وہ بہت خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں ابھی بھی نمی تیر رہی تھی۔

"اس گھر میں تمہارے لیے بہت محبتیں، بہت چاہتیں ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں سب تم سے۔ تمہارے جانے سے یہ گھر بہت سونا ہو گیا تھا اور ہم سب بہت اداس۔"

"لیکن میں تو سب کو بہت مس کرتی تھی۔" وہ گم صم سے انداز میں بولی تھی۔ تب ہی صباحت نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"مما آ رہی ہیں۔"

نبیل نے گردن موڑ کر دیکھا تو صباحت جز بز ہی ہو کر واپس پلٹنے لگی کہ وہ پکار کر بولی۔

"صبا! تم نے مما کو کیوں پریشان کیا؟"

"پریشان نہیں تو۔ مما تو بہت خوش ہوئیں تمہارا سن کر، اور ہاں تم نیچے سب سے مل کر آ کر رہی ہو!" صباحت واپس پلٹنے کا ارادہ ترک کر کے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"نہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں سیدھی اوپر چلی آئی۔" اس نے جواب دیتے ہوئے بیڈ کی بیک پر سر رکھا تو اس کا ذہن اس مسافت کو سوچنے لگا جو وہ طے کر کے آئی تھی۔

نبیل بغور اسے دیکھ رہے تھے اور صباحت کی نظریں نبیل پر تھیں۔

اور لمحے بہت خاموشی سے سرکتے جا رہے تھے۔ تینوں میں سے کسی کو پتا نہیں چلا کب آسیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ البتہ اس کی پکار نے ایک دم ہلچل مچا دی تھی۔

"مدحو!"

نبیل اور صباحت چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جبکہ وہ چونکنے کے ساتھ ہی چھلانگ لگا کر آسیہ کے سینے سے جا لگی اور یوں مچل مچل کر رونے لگی کہ اسے چپ کراتے کراتے آسیہ خود نڈھال ہو گئی تھی۔ آخر سکون کا انجکشن

لگا کر اسے سلا دیا اور کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد نبیل اور صباحت کو لے کر کمرے سے نکل کر آئی تو بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"کون چھوڑ گیا ہے مدحو کو۔"

"پتا نہیں پھوپھو! صبا نے کچھ بتایا ہی نہیں اور مجھے اس وقت خیال ہی نہیں آیا کہ میں باہر نکل کر دیکھتا۔ اصل میں جب وہ آئی تو اتنی خوفزدہ تھی اور اتنا رو رہی تھی کہ میں۔"

نبیل بتاتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئے تو آسیہ نے مزید نہیں کریدا اور ان دونوں کو کھانا کھانے کی تاکید کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کل شاہ سکندر اس سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ آج مدحیہ کو لے آئیں گے۔ اس کے خیال میں وہی اسے چھوڑ گئے ہوں گے۔ لیکن مدحیہ کا خوفزدہ ہونا اور رونا اس کے خیال کی نفی کر رہا تھا۔ کتنی دیر وہ اسی بات میں الجھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر لیٹ گئی کہ اصل بات مدحیہ سے معلوم ہو جائے گی۔ بتے اس نے انجکشن دے کر سلایا تھا اور شام سے پہلے اس کا اٹھنا متوقع نہیں تھا۔ اس لیے اس کی طرف سے کچھ بے فکر ہو کر آسیہ خود بھی سو گئی تھی۔ یوں بھی وہ پیر کی نیند اس کے معمول میں تھی اور معمول کے مطابق ہی وہ ساڑھے نو بجے اٹھ بھی گئی تو پہلے مدحیہ کے پاس جا کر اسے چیک کیا پھر اس کے قریب پریشان بیٹھی صباحت کو دیکھ کر قصداً مسکرا کر بولی۔

"کوئی فکر کی بات نہیں ہے بیٹا! یہ ابھی تھوڑی دیر میں بہت فریش اٹھے گی۔ جب تک تم چائے کے ساتھ کچھ ناشتے کا انتظام کر لو۔ کیونکہ اس نے دوپہر میں کچھ نہیں کھایا تھا۔"

"آپ نے بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا؟" صباحت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن پہلے میں شاور لوں گی۔"

"ٹھیک ہے مما! میں اتنے میں بسکٹ اور کیک منگوا لیتی ہوں، اور ہاں ماں جی دو بار مدحو کو دیکھ کر جا چکی ہیں کہہ رہی تھیں کہ جب یہ اٹھے تو مجھے بلا لینا۔" صباحت نے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے دیکھا۔

"ہاں بلا لو۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور وارڈ روب سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد جب دوبارہ مدحیہ کے پاس آئی تو وہ چھت پر نظریں جمائے ساکت لیٹی تھی۔

"مدحو! کیسی ہو بیٹا؟" آسیہ نے اس پر جھک کر پوچھا تو اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں پھر گہری سانس کے ساتھ بولی تھی۔

"ٹھیک ہوں مما۔"

"گڈ!" آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "چلو منہ ہاتھ دھو لو، پھر چائے پئیں گے۔"

"مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے لیکن ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔" وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"صبا نے انتظام کر دیا تم آؤ تو۔"

وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آسیہ کے ساتھ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی جہاں صباحت نے چائے کے ساتھ اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اور خود جانے کہاں تھی؟

"صبا کہاں چلی گئی اور نبیل بھائی؟" اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نبیل!" آسیہ نے وہیں سے نبیل کو پکارا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ "صبا آ رہی ہے تمہاری ماں جی کو لے

کر۔"

"اماں جی اور ابا جی کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں بیٹا! چائے پی لو پھر نیچے چلتے ہیں۔" آسیہ نے پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

تب ہی نبیل آ گئے اور ادھر سے صباحت بھی میمونہ بھابھی کے ساتھ آ رہی تھی۔

السلام علیکم ماں جی! ان کے قریب آنے پر اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا اور میمونہ بھابھی کے گلے لگ گئی۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔" میمونہ بھابھی نے اس کے گال پر پیار کیا پھر بیٹھتے ہی پوچھنے لگیں۔ کس کے ساتھ آئی ہو؟"

آسیہ اس کا جواب سننے کے لیے بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"کسی کے ساتھ نہیں۔ اکیلی آئی ہوں۔" اس کے جواب پر آسیہ کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

جبکہ میمونہ بھابھی اچھل پڑیں۔

"اکیلی؟ شاہ پور والوں نے تمہیں اکیلا بھیج دیا؟"

"انہوں نے نہیں بھیجا وہ تو بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میں خود آئی ہوں کسی کو بتائے بغیر۔" وہ ابھی کسی کے متعلق کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ اس لیے سارا الزام اپنے سر لے لیا اور پھر خود بھی حیران سی ہو گئی۔ شاید اس لیے کہ یہ پہلا موقع تھا جو اس نے کسی مصلحت کا دامن تھاما تھا۔

"کسی کو بتائے بغیر۔" آسیہ نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں کلینک فون کر دوں۔"

"آپ کلینک جا رہی ہیں مما؟" مدحیہ نے فوراً پوچھا۔

"نہیں بیٹا! اس لیے تو فون کر رہی ہوں۔" آسیہ اس کا گال تھپک کر آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے وہ جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ دیکھ رہی تھی کہ صباحت ان سے شاہ پور والوں خصوصاً شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کے لیے کتنی بے چین ہے اور وہ خود بھی اب تک کی ساری روداد ان کو سنانا چاہتی تھی اور اس کے لیے دونوں انتظار کر رہی تھیں کہ نبیل اور آسیہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جائیں، لیکن جب سونے کا وقت آیا تو آسیہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ جس پر اسے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ جز بز ضرور ہوئی۔ اور جاتے جاتے مڑ کر صباحت سے کہنے لگی۔

"سنو! میں مما کے پاس سوؤں گی نہیں۔ میرا مطلب ہے جب وہ سو جائیں گی تو تمہارے پاس آ جاؤں گی تم سونا نہیں۔"

"مجھے نیند کہاں آئے گی۔" صباحت نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں آتی ہوں۔" وہ کہہ کر آسیہ کے کمرے میں آئی تو زیرو پاور کی مدھم روشنی میں نیم دراز آسیہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آؤ بیٹا میرے پاس لیٹو۔"

"آپ میرے لیے پریشان تھیں مما؟" وہ اداسی لیٹی اور دونوں ہاتھ ملا کر ان پر تھوڑی ٹکا کر پوچھنے لگی۔

"ہوں۔" آسیہ نے ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔ "پریشان تو میں تھی اور یہ خیال بھی تھا کہ تم اپنے باپ کے پاس ہو۔ اس لیے اتنا وقت میں نے خاموشی میں گزار دیا۔"

"بابا تو بہت کم شاہ پور میں رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھیں آرام کی غرض سے ایک دو دن کے لیے جاتے ہیں ورنہ کبھی کہاں کبھی کہاں۔ ابھی بھی شاید کینیڈا میں ہیں۔"

"نہیں تو ابھی کل۔" آسیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر سنبھل کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہنے لگی۔

"بیٹا! مجھے صباحت کی فکر ہے۔ انجانے میں جو ہو گیا سو ہو گیا، لیکن اب جان بوجھ کر تو میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔ پتا نہیں سب لوگ کیسے ہیں؟ اگر اچھے ہوں تب بھی میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے ان کا مقصد صرف مجھ سے بیٹیاں چھیننا ہے۔ تم تو وہاں رو کر آئی ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"ایسا ہی ہے مما! میں نے خود سنا تھا۔ بابا جان۔ جہانگیر چاچا سے کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے کہہ دیں کہ اگر آپ میری سلامتی چاہتے ہیں تو صباحت کو رخصت کر دیں اس کے بعد سے مما! مجھے لگا میں آپ کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔" وہ ایکدم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"ارے نہیں بیٹا! روؤ نہیں میری جان۔" آسیہ نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ "تم تو بہت بہادر ہو اور تم نے یہ بات اپنے باپ سے کیوں نہیں کہی؟"

"میں اس وقت بابا کو بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پھر بھی میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے کراچی لے چلیں لیکن انہوں نے آئندہ پر ٹال دیا جس سے میں یہی سمجھی کہ وہ بھی بابا جان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لیے وہاں رہنے نے ان سے یہاں آنے کی بات نہیں بلکہ شاید موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں وہ اسلام آباد چلے گئے تھے۔ پھر میں نے بہت ہمت کر کے بابا جان سے کہا تو وہ مجھے یہاں لانے کا کہہ کر اپنے رقعوں پر چھوڑ آئے تھے۔" وہ بولتی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی ناک سے سُوں سُوں کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔

"رقعے پر کس کے پاس؟" آسیہ کے وجود میں انگارے سلگنے لگے تھے۔

"کسی کے پاس نہیں۔ اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار اور اس کی بیوی تھی۔ اس رات مجھے بہت ڈر لگا اور میں بہت روئی تھی۔" اس نے اس رات کے تصور سے جھرجھری لی پھر آسیہ کا ہاتھ اپنے گال پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کو بہت تنگ کرتی تھی نا مما! اس لیے میرے ساتھ ایسا ہوا۔"

"نہیں بیٹا! ایسا مت سوچو۔" آسیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ پھر پوچھنے لگی۔ "تم وہیں ریسٹ ہاؤس سے آ رہی ہو؟"

"نہیں مما! وہاں سے شاہ تیمور مجھے کہیں اور لے گئے تھے، پھر پھوپھو شہر بانو کے پاس تین دن چھوڑا اور آج دن میں حیدر آباد لے کر آئے تھے۔ شاپنگ کے لیے وہیں مجھے موقع ملا اور میں انہیں چھوڑ کر بس میں سوار ہو گئی۔" اس نے بتایا تو آسیہ پرسوچ انداز میں اسے دیکھے گئی۔

"مجھے ابھی بھی ڈر لگ رہا ہے مما! وہ لوگ یہاں تو نہیں آ جائیں گے۔" اس نے آسیہ کا ہاتھ ہلا کر کہا۔

"کون؟" آسیہ نے چونک کر پوچھا۔

"شاہ پور سے کوئی بھی۔ آپ کسی کو نہیں بتائیے گا کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ میں اب کہیں نہیں

جاؤں گی اور شاہ پور تو کبھی بھی نہیں۔ پاپا کو اگر ملنا ہو گا تو وہ یہیں۔" اس نے ایک دم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور کچھ خائف بھی ہو گئی تھی۔

"یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تم ڈرو مت۔ کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ میرے پاس سے تمہیں یا صبا کو لے جائے۔" آسیہ نے اس کا گال تھپک کر تسلی دی پھر اپنے پیچھے سے ایک تکیہ نکال کر برابر میں رکھتے ہوئے بولی۔

"چلو اب تم سو جاؤ۔"

"یہاں نہیں مما! میں اپنے کمرے میں سوؤں گی۔" وہ صباحت کا خیال کر کے اٹھ گئی۔

"ڈرو گی تو نہیں؟"

"اگر ڈر لگا تو آپ کے پاس آ جاؤں گی۔" وہ آسیہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ پھر شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ سو رہے تھے لیکن صباحت جاگ رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹتے ہوئے بولی۔

"میں تو آ گئی ہوں، لیکن تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

صباحت خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"تم ذرا بھی نہیں بدلیں۔" صباحت نے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کوئی مطلب نہیں چلو سو جاؤ۔" صباحت کروٹ بدلنے لگی تھی کہ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سونا ہوتا تو میں مما کے پاس نہ سو جاتی۔ تمہارے لیے آئی ہوں میں یہاں مجھے پتا ہے تم اندر سے کتنی بے چین ہو اور کس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔"

"کس کے؟"

"علی جہانگیر کے اور کس کے؟" اس نے شرارت سے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا۔

"جی نہیں، میں اس کے بارے میں جان کر کیا کروں گی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔ تم صرف اپنی بات کرو۔ تم نے ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کیا؟" صباحت نے اپنے اندر کے سارے تجسس کو دبا کر بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"میں نے، میں نے کیا پریشان کیا؟"

"کیوں شاہ پور پہنچنے کے کتنے عرصے بعد تم نے یہاں اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور میں نے جب تم سے آنے کا کہا تم نے یہی جواب دیا کہ تم کبھی نہیں آؤ گی اور ابھی کچھ دن پہلے تم نے اپنی شادی کی اطلاع دے کر ہم پر بڑا احسان کیا تھا۔" صباحت خاصی ناراضی سے اسے لتاڑنے لگی تھی۔ وہ سن کر بھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر گہری سانس کھینچ کر کہنے لگی۔

"یہ صحیح ہے، ابتدا میں، میں نے قصداً سب کو پریشان کیا۔ یہاں اور وہاں بھی، کیونکہ میں سب سے متنفر تھی اور اس تنفر کی وجہ سے سب کی تمہارے ساتھ محبت جبکہ میرے لیے کسی کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اب پتا نہیں واقعی ایسا تھا یا محض میری سوچ نے مجھے سب سے شاکی کر دیا تھا۔ بہرحال شاہ پور جا کر، میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کسی کو میری پروا نہیں تو پھر میں کیوں اپنی خیریت کی اطلاع دوں جبکہ وہاں بھی سب خصوصاً بابا جان، علی جہانگیر اور

پاپا اس بات سے پریشان تھے کہ میں مما کو فون کیوں نہیں کر رہی؟ وہ تو خیر یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہاں مما پر کیا بیت رہی ہے اور میں انہیں کوئی اطمینان نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے ان کے بار بار ٹوکنے پر بھی میں نے فون نہیں کیا اور جب کیا تو تم پر ہی ظاہر کیا کہ میں وہاں بہت خوش ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی اور میں سچ کہوں تو اس وقت میرے اندر عجیب سی رقابت تھی کہ یہاں وہاں ہر جگہ صبا صبا کی پکار ہے اور میں کہیں نہیں۔ مقدر لکھنے والے نے آخر سب کچھ تمہارے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ میرے لیے کیوں کچھ نہیں؟ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ کائنات کے سارے نظام دو اور لو کے اصول پر چل رہے ہیں اور میں تو دینا جانتی ہی نہیں صرف لینا چاہتی ہوں۔''

اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

صبا گم صم سے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''وہاں بھی میں شاید صرف لینا چاہتی تھی۔'' اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''خود سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا اور یہ توقع کرنے لگی کہ سب میری طرف آئیں گے، جیسے میں کوئی بہت اہم ہستی ہوں۔ اہم تو کیا میری تو ان کے نزدیک رتی برابر حیثیت نہیں تھی، یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے بابا جان کی باتیں سنیں۔ جب اپنی سلامتی تو خطرے میں نظر آئی ہی ساتھ تمہاری فکر نے بھی گھیر لیا تھا۔ میں سوچتی تھی اگر مما نے بابا جان کی شرط مان کر تمہیں رخصت کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے دونوں بیٹیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی اور میں چاہتی تھی کہ مما کو خبردار کروں لیکن جب بھی فون کرتی کوئی نہ کوئی آس پاس آن موجود ہوتا جب اسے سنانے کے لیے مجھے یہ کہنا پڑتا کہ میں بہت خوش ہوں اور کبھی نہیں آؤں گی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ بابا جان کو میری طرف سے ذرا سا بھی شبہ ہو۔ جس طرح وہ بظاہر مجھ سے اچھے طریقے سے ملتے تھے تو میں بھی ان پر ایسا ہی ظاہر کرتی تھی۔

پھر ایک بار میری وہی پہلے والی خود سری عود کر آئی اور میں نے سوچا کہ میں کیوں ان لوگوں سے ڈر رہی ہوں۔ مجھے صاف لفظوں میں کہہ دینا چاہیے کہ میں واپس جانا چاہتی ہوں اور جب میں نے بابا جان سے ضد کی تو وہ مجھے رقیب پر چھوڑ آئے۔ اس رات مجھے تم سب بہت یاد آئے۔ تم سب کی محبتیں اپنی زیادتیاں۔ کیا کیا نہ یاد آیا اور مجھے لگا ان محبتوں اور چاہتوں سے منہ موڑنے کی سزا مل رہی ہے مجھے اور ملنی بھی چاہیے تھی۔ ہے نا۔''

اس نے صباحت کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر تائید چاہی۔ لیکن ادھر کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ تو قدرے توقف سے وہ مزید گویا ہوئی۔

''اس کے بعد مجھے بابا جان کی مرضی کا کھیل کھیلنا پڑا۔ شاہ تیمور پر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مما کے گھر میں ہمیں کچھ میسر نہیں ہے مزید سب کے رویے بھی ناقابل برداشت ہیں اور یہ کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں بابا۔''

اپنی آخری بات پر وہ خود ہی ہنسی۔ پھر کہنے لگی۔

''بہر حال میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس کے موبائل پر میں نے یہاں فون کر کے کہا تھا کہ میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔ اس کے بعد میرا خیال تھا میں کسی دن اس سے کراچی چلنے پر اصرار کروں گی تو وہ منع نہیں کرے گا' لیکن اتفاق سے مجھے اس سے پہلے ہی موقع مل گیا اور میں اسے چکر دینے میں کامیاب ہو گئی اور دیکھو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ زندہ سلامت۔ حالانکہ خود مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی آنکھ کھلے گی اور اف نہیں۔''

اس نے جھرجھری لی پھر صباحت کا بازو ہلا کر بولی۔

''تم کچھ بولو گی نہیں۔ اچھا ہاں تمہارے علی جہانگیر، تو میں نے بتایا نہیں تو وہ بے چارہ۔''

''مدحو پلیز۔'' صباحت نے عاجزی سے ٹوکا۔ ''مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں جاننا۔''

''کیوں؟''

''اسی لیے کہ مما نے اسے طلاق کا نوٹس بھجوا دیا ہے۔'' صباحت نے بتایا تو وہ اچھل پڑی۔

''کب؟ کیوں؟''

''کیوں کا کیا مطلب تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد کیا یہ رشتہ قائم رہ سکتا ہے؟''

مدحیہ فوراً کوئی جواب نہیں دے سکی۔ تو وہ بیزاری سے ٹوک کر بولی۔

''چھوڑو اس بات کو۔ تم مجھے پاپا کا بتاؤ۔ وہ کیسے ہیں اور تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہوا انہوں نے کچھ نہیں کیا کوئی اسٹینڈ نہیں لیا؟''

''وہ کیا اسٹینڈ لیتے انہیں تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی کہ بابا جان کے منصوبوں میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور بعد میں میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ کینیڈا چلے گئے تھے ابھی بھی شاید وہیں ہیں۔''

مدحیہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر تک پرسوچ انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر اسی انداز میں کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے وہ یہیں کراچی میں ہیں۔ کل انہوں نے یہیں سے فون کیا تھا مجھے۔''

''پاپا نے؟'' مدحیہ نے فوراً پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے میں جلد تم سے ملنے آؤں گا۔'' وہ بتا کر خائف سی ہو گئی پھر اس کا ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔ ''سوئٹی مما کو نہیں بتانا۔''

''کیوں؟ جب ملنے آئیں گے تب مما کو پتا نہیں چلے گا یا وہ کوئی طلسماتی ٹوپی پہن کر آئیں گے۔''

مدحیہ نے تنک کر کہا۔

''جب آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ تم بہر حال مما کو نہیں بتاؤ گی، سمجھیں۔'' صباحت بھی تیز ہو کر بولی تھی۔

''سمجھ گئی۔'' خلاف عادت وہ بڑی جلدی مان کر لیٹ گئی تھی۔

❋ ❋ ❋

شاہ سکندر اس امید پر دو دن کاٹیج میں رہے تھے کہ شاید مدحیہ آ جائے۔ حالانکہ علی جہانگیر نے شاہ تیمور سے معلوم کرنے کے بعد انہیں بتا دیا تھا کہ وہ کراچی جا چکی ہے اور پھر اس نے انہیں اپنے ساتھ چلنے پر اصرار بھی کیا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ انہیں اب کسی کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ اگر مدحیہ کراچی پہنچ گئی ہوتی تو آسیہ اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتی اور اب تو خود انہیں بھی اس کی سلامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بابا جان اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے اور اس بار اپنے اشارے پر چلانے کے لیے انہوں نے شاہ تیمور کا انتخاب کیا تھا۔

ان دو دنوں میں شاہ سکندر نے بہت ساری باتیں سوچی تھیں تو انہیں بابا جان کی وہ بات بھی یاد آئی جو انہوں نے کہا تھا کہ آسیہ سے صباحت کی رخصتی کی بات کرو تو مدحیہ کی بات بھی کر لینا۔ شاہ تیمور کے ساتھ۔ گویا وہ ان کی دونوں بیٹیوں کے لیے بھی باقاعدہ پلان بنا چکے تھے اور وہ اتنے بے خبر تھے انہیں ابھی تک ذرا بھی شبہ نہ آیا تھا۔ ہم

حال تیسرے دن صبح وہ شاہ پور پہنچے تو بابا جان سے بس سلام دعا کی حد تک ہی ملاقات کی۔ مدیحہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے ادھر سے ایک ہی جواب آئے گا۔ جس کا انہیں یقین نہیں تھا اور بابا جان سے مزید الجھنے کا وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ اس لیے ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ وہ مدیحہ کی تلاش میں گئے تھے۔ نہ اس کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا تھا البتہ دوپہر کے کھانے کے بعد بی بی جان کے پاس آ کر بیٹھے اور پہلے ان کا حال احوال پوچھا پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے مدیحہ کا ذکر لے آئے۔

"مدیحہ کے جانے سے آپ کو بھی کوئی فرق پڑا ہے بی بی جان کہ نہیں؟"

"کیوں نہیں۔ بچی صبح شام میرے پاس آ کر بیٹھی تھی اور دوسری لڑکیوں کو بلاؤ تو سو بہانے ہوتے ہیں۔ وہ تو خود آتی تھی۔ بہت محبت کرنے والی بچی ہے۔ شہر بانو بھی تعریف کر رہی تھی کہ دو دن میں اس کے ساتھ ایسے گھل مل گئی جیسے پتا نہیں کب سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔" بی بی جان مدیحہ کی تعریف کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

وہ ان کی آخری بات پر بری طرح چونکے تھے۔

"وہ شہر بانو کے ہاں کب گئی تھی؟"

"پتا نہیں مجھے تو آج صبح شہر بانو کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ مدیحہ دو تین دن اس کے پاس رہ کر گئی ہے۔ کیوں کیا تمہیں اس کے شہر بانو کے گھر جانے پر اعتراض ہے؟" بی بی جان نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں اعتراض کیوں ہوگا؟ بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ سب سے ملے اور اور کیا کہہ رہی تھی شہر بانو؟" وہ اب بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر رہے تھے۔ ورنہ دل یہ چاہ رہا تھا ایک دم سے ہر بات اگلوا لیں۔

"بس اسی کی باتیں تھیں اور ہاں یہ تم باپ بیٹے نے اتنی خاموشی سے کیسے مدیحہ کی بات طے کر دی۔" بی بی جان کو جیسے اچانک یاد آیا تھا۔

"نہیں تو میرا مطلب ہے آپ سے کس نے کہا؟" وہ مزید الجھ گئے تھے۔

"وہی شہر بانو بتا رہی تھی بلکہ گلہ کر رہی تھی کہ بابا جان نے مدیحہ اور تیمور کی نسبت طے کر دی اور اسے بتایا نہیں۔ میں نے لاکھ کہا یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن وہ مانی نہیں۔ کہنے لگی مدیحہ نے خود مجھ کو بتایا ہے کہ اس کی تیمور کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔"

"پتا نہیں بی بی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔" ان کا ذہن چٹخنے لگا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے بولے تھے۔

"تو کیا تمہیں بھی معلوم نہیں ہے۔" بی بی جان نے تعجب سے پوچھا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔" ان کی بے بسی اور ٹوٹے ہوئے لہجے پر بی بی جان دہل گئیں۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"بابا جان سے پوچھیں جا کر کہ وہ میری بیٹیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟ میں اگر ان کے مقابل کھڑا ہوا تو۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر غصے جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے تو بی بی جان حواس باختہ ہو گئیں۔

"ک۔ کہاں جا رہے ہو سکندر؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پیچھے بی بی جان پکار رہی تھیں۔ لیکن وہ رکے نہیں پہلے شاہ یونس حیات کے پورشن میں جا کر ان سے شاہ تیمور کا پوچھا پھر وہیں سے باہر نکلے اور گاڑی میں

بیٹھتے ہی ڈرائیور سے شاہ ہارون کے ہاں چلنے کو کہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ شہر بانو کے پاس موجود تھے۔

شہر بانو نے انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے ذہن پر مدیحہ سوار تھی۔ اس کے اتنے والہانہ انداز کے جواب میں بس اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور فوراً پوچھا۔

"مدیحہ آئی تھی؟"

"جی بھائی' ماشاء اللہ بہت۔"

"کس کے ساتھ آئی تھی؟" انہوں نے فوراً دوسرا سوال کیا تو خوشی کا اظہار کرتی ہوئی شہر بانو ایک دم خاموش ہو گئی، پھر ان کے تیور دیکھ کر کچھ خائف سی ہو کر بولی۔

"تیمور کے ساتھ؟"

"کتنے دن رہی تمہارے پاس؟"

"تین دن؟"

"تیمور بھی ساتھ تھا؟"

"نہیں وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"پھر اسے لینے بھی وہی آیا تھا؟"

"جی۔ خیر تو ہے ناں بھائی! کیا ہوا ہے؟" شہر بانو نے تشویش سے پوچھا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"کہاں لے گیا ہے؟"

شہر بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بتاؤ شہر بانو تم سے کچھ تو کہا ہوگا تیمور نے۔"

"یہاں سے کہاں جانے کا پروگرام تھا اس کا؟" وہ اس کی چند لمحوں کی خاموشی سے جھنجھلا گئے تھے۔

"پتا نہیں بھائی! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ خدا کے لیے آپ یہ تو بتائیں کیا ماجرا ہے؟" شہر بانو ان کے سوالوں سے پریشان ہو کر عاجزی سے بولی۔

"ماجرا..... ہونہہ۔" وہ بہت مضطرب سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

شہر بانو اندیشوں کی زد میں آ کر اندر ہی اندر ہولنے لگی تھی۔ انہیں مخاطب کرنا چاہتی تھی، لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"سنو شہر بانو اب اگر تیمور مدیحہ کو لے کر یہاں آئے تو فوراً مجھے اطلاع کرنا اور میرے آنے تک مدیحہ کو اپنے پاس روکے رکھنا سمجھیں۔"

شہر بانو کچھ بھی نہیں سمجھی' لیکن فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ جانے کا کہہ کر چل بھی پڑے تو شہر بانو حیران پریشان سی ان کے پیچھے لپکی۔

"بھائی! اتنے عرصے بعد آئے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں تو' کوئی چائے پانی۔"

"ابھی بہت کام ہیں شہر بانو، پھر آؤں گا۔" انہوں نے پلٹ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر تیز قدموں

سے باہر نکلے تھے۔

"یہاں سے مایوس ہو کر اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مزید آسیہ کے سامنے جوابدہی کا خیال بھی پریشان کرنے لگا۔ وہاں سے اگلے دن ہی مدیحہ کو لانے کا کہہ کر آئے تھے اور یہاں چار دن ہو گئے تھے۔

"یا اللہ کہیں تو اس عورت کے سامنے مجھے سرخرو کر دے۔" انہوں نے پہلے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے سر سیٹ کی بیک پر رکھ لیا۔

گاڑی اونچے نیچے راستوں سے نکل کر شفاف سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ دور سے حیدرآباد دیکھ کر انہوں نے ایک دم کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی شہر جانے والی سڑک پر موڑنے کا کہہ کر پھر آسیہ کو سوچنے لگے۔ جس کے سامنے چند دن پہلے وہ اعتراف کر کے آئے تھے کہ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اب وہ اسے بتائیں گے کہ ان کی زندگی میں آنے والے سارے امتحان، ساری آزمائشیں اور ساری تکلیفیں اسی محبت کی مرہون منت ہیں۔

٭ ٭ ٭

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، جب وہ علی جہانگیر کے بنگلے پر پہنچے۔ مسلسل سفر اور مسلسل ٹینشن نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا پھر بھی ان کا آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا شاور لیں گے۔ اور ایک کپ چائے کے ساتھ علی جہانگیر سے شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے، بس اسی لیے اس کے بنگلے پر آ گئے تھے۔

علی جہانگیر کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آیا تھا۔ ان کی آمد پر تو حیران نہیں ہوا لیکن ان کا حلیہ پریشان کن تھا۔

"خیریت چچا جان؟" ان کے گلے لگتے ہوئے اس نے فوراً پوچھا۔

"مدیحہ کا کچھ پتا چلا؟" ان کے سوال میں جواب موجود تھا۔

"مدیحہ..." وہ ان کی پریشانی سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

"میں سارے میں معلوم کر آیا ہوں بابا جان نے پتا نہیں اسے کہاں چھپا دیا ہے اور اس بار یہ کھیل انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ خیر تم جلدی سے چائے بنواؤ، مجھے آسیہ کے پاس جانا ہے۔" انہوں نے اچانک عود کر آنے والے تنفر کو دبا کر کہا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا، آسیہ کے پاس کس سلسلے میں لیکن ان کی پریشانی سمجھتے ہوئے خاموش رہا پھر کرم دین کو پکار کر اس نے چائے کا کہا۔ اس کے بعد انہیں دیکھ کر بولا۔

"چائے سے پہلے آپ باتھ لے لیں۔"

"ہاں!" وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اٹھے تھے۔

پھر کچھ دیر میں وہ باتھ لے کر آئے تو غالباً وہی کپڑے دوبارہ پہننے کی وجہ سے خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔ چائے پیتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر مسلسل ناگواری کا تاثر رہا۔

علی جہانگیر کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ کہیں گے لیکن جب وہ متوجہ ہی نہیں ہوئے تب اسے خود مخاطب

کرنا پڑا۔

"چچا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا آپ کو یقین ہے مدیحہ کو بابا جان نے کہیں ادھر ادھر..."

"ہاں، حالات یہی ظاہر کرتے ہیں۔ مجھ سے انہوں نے اس وقت جب میں کینیڈا جا رہا تھا، کہا تھا کہ وہ مدیحہ کو کراچی چھوڑ آئے ہیں۔ جبکہ وہ یہیں پر تھی۔ خود تم نے اسے کالج میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ تین چار دن شہر بانو کے پاس رہی۔ وہاں سے پتا نہیں چل رہا کہ تیمور اسے کہاں لے گیا ہے؟ بہر حال کہیں بھی ہو میں اسے..." وہ بولتے ہوئے ایک دم ہونٹ بھینچ گئے پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان کی تقلید کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ ڈاکٹر آسیہ کے پاس کیوں جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ان سے مدیحہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔" وہ بے اختیار کہہ گئے، پھر کچھ یوں وضاحت کرنے لگے۔

"آخر کہاں تک میں ان سے غلط بیانی کروں؟ غلط بیانی کی وجہ سے ہی سارے کام خراب ہو رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آسیہ کو حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔"

علی جہانگیر اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے بس سر ہلا کر رہ گیا۔

"او کے، میں چلتا ہوں۔"

"آپ واپس یہیں آئیں گے نا؟" وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم انتظار نہیں کرنا۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

انہوں نے علی جہانگیر سے تو بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ آسیہ کو حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔ لیکن جیسے جیسے کلینک قریب آ رہا تھا ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس بار وہ سیدھے آسیہ کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکے۔ پہلے چوکیدار سے کہلوایا اور اس کا جواب سن کر باہر ہی اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اس وقت انہیں اپنی کوئی حیثیت یاد نہیں تھی۔ بلکہ ایسا باپ جو گمشدہ بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد اب اس کی ماں کے سامنے جانے سے خوفزدہ ہو کر اسے کیا کہے گا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد غالباً آسیہ نے اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر انہیں بلوایا تھا۔ اور اتنی دیر میں وہ بجائے خود کو ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار کرنے کے منفی سوچوں میں گھرے رہے تھے۔ جب ہی آسیہ کے کمرے میں وہ کسی مجرم کی طرح داخل ہوئے تھے اور ان کے برعکس وہ بڑی پر اعتماد تھی۔

"تشریف رکھیں۔"

وہ کسی معمول کی طرح بیٹھ گئے، تو آسیہ نے یوں دروازے کی سمت دیکھا جیسے کسی اور کی آمد متوقع ہو پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"مدیحہ نہیں آئی؟"

انہوں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ جبکہ اندر اچانک ایک جنگ شروع ہو گئی تھی کہ وہ کیوں اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ مدیحہ صرف اس کی بیٹی تو نہیں ہے۔

"آپ کچھ پریشان ہیں؟" آسیہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ہاں نہیں۔" وہ الجھ گئے۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ جیسے بے اختیار ہو گئے تھے۔

"میں تھک گیا ہوں آسیہ! اتنا لمبا سفر جانے کیسے طے ہو گیا۔ مزید ایک قدم نہیں چل سکتا۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں۔ کیا کروں کس سے کہوں کہ کس جرم کی سزا پائی ہے میں نے جو ختم ہونے میں نہیں آتی، تم ہاں تم سے کہوں گا۔ کیونکہ ابتداء تم سے ہوئی تھی۔"

آسیہ سراسیمہ سی انہیں نوفا بکھرتا دیکھ رہی تھی۔

اور انہیں جیسے کسی بہت اپنے کا کاندھا میسر آ گیا تھا جس پر سر رکھ کر رو لینے سے دل کا سارا غبار دھل جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی کتاب زندگی کے تمام اوراق اس کے سامنے الٹ کر شانت ہو گئے تھے۔ کرسی کی بیک پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

آسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے؟ اس بے قصور شخص کو معاف کر دے یا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پوچھے کہ یہ ساری باتیں اس نے اس وقت اسے کیوں نہیں بتائیں جب اس کے دل کی بستی اس کے دم سے آباد تھی۔ اب کیوں بتا رہا ہے جب اندر سب کھنڈر ہو چکا۔

اس کی زندگی کی خاطر بابا جان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کے بنا وہ کیسے جئے گی۔

اف سکندر حیات تم نے تو حد کر دی۔ اب اس مقام پر یہ کہہ رہے ہو کہ یہ زندگی بھی بابا جان کی بخشی ہوئی ہے۔

میرے خدا اشرف المخلوقات بنایا تو ایک ذرا سا اختیار وقت پر بھی دیا ہوتا۔ میں ایسا کیا کروں جو گزرے ماہ و سال سمٹ کر میری مٹھی میں آ جائیں پھر یا تو میں اپنا ہر دن اس شخص کو دان کرتی جاؤں یا خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔

تم ایسے بزدل سکندر حیات اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔

کاش یہ اختیار پہلے کرتے مجھ پر تو شاہ پور کا رئیس تو کیا دنیا کی کوئی طاقت میرے دل کی بستی نہیں اجاڑ سکتی تھی۔

کتنا کٹھن مرحلہ آیا تھا جو گزر کے نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اندر صف ماتم بچھ گئی تھی۔ سارے دکھ ایک ساتھ سسکنے لگے تھے وہ بھی جو ابھی ابھی شاہ سکندر نے اس کی جھولی میں ڈالے تھے اور سدا کا بے رحم وقت اب نظریں چرائے گزر رہا تھا کیونکہ ان دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتا تھا۔

کتنی دیر بعد شاہ سکندر نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ وہ بیچ ویٹ پر نظریں جمائے جانے کس کرب سے گزر رہی تھی۔ جو اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ وہ قصداً ذرا سا کھانسے تو وہ چونکنے کے ساتھ سیدھی ہو بیٹھی اور کچھ دیر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

"حالات و واقعات مقدر کے تابع ہوتے ہیں، شاہ سکندر حیات! جو کچھ ہمارے لیے لکھا گیا ہوتا ہے وہ ضرور ہوتا ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی طرح سہی۔ میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ کسی نے کیا کہا یہی میرا نصیب تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اندھے کنوئیں میں میں یہ سوچ کر چھلانگ لگا دوں کہ مقدر میں اگر ڈوبنا مرنا نہیں لکھا تو میں زندہ سلامت نکل آؤں گی۔ نہیں اللہ نے ذہن دیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے پھر حالات و واقعات ہمیں اور بہت کچھ سکھاتے ہیں اور سیکھنے کے بعد بھی اگر دوبارہ وہی غلطی دہرائی جائے تو اس کے

نتائج پہلے سے بھی زیادہ خوفناک نکلتے ہیں۔ آپ میری اس بات سے تو اتفاق کریں گے ناں۔"

شاہ سکندر بہت آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگے تھے۔

"پھر آپ بتائیں میں کیا کروں۔ جس راستے پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوں میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹیوں کے لیے اس راہ کا انتخاب کیسے کروں۔ گزشتہ بار آپ نے کہا تھا کہ میں ایک بار اور آپ کا اعتبار کر لوں، کیسے کر لوں؟ آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مدیحہ کہاں ہے جبکہ صباحت کے بارے میں آپ جانتے تھے۔ میرا مطلب ہے۔ اس کی شادی کے سلسلے میں آپ کے بابا جان نے جو پلاننگ کی اس سے آپ بے خبر نہیں تھے بلکہ آپ ان کے ساتھ شریک تھے کیوں؟" وہ ان کا محاسبہ کرتے ہوئے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میرے پیش نظر صباحت کی بہتری تھی اور ہے۔" انہوں نے ہے پر زور دے کر گویا اس رشتے کو قائم رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہے۔" وہ کتنی دیر ان پر تاسف سے نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں شاہ سکندر حیات! آپ پتا نہیں کس پہلو سے صبا کی بہتری سوچ رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے بابا جان نے ایک بار پھر۔"

"نہیں۔" وہ فوراً بول پڑے۔ "یہ صحیح ہے کہ بابا جان نے صباحت کے حصول کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا تھا لیکن وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

"کیسے نہیں پہنچا سکتے۔ مدیحہ کے ساتھ انہوں نے کیا کیا؟" وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

شاہ سکندر ابھی خود ہر بات کا اعتراف کر چکے تھے اس لیے لاجواب ہو کر رہ گئے پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

"مدیحہ کو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی دونوں پوتیاں شاہ پور میں بیاہی جائیں اور اسی مقصد سے انہوں نے مدیحہ کو اپنے پاس روک رکھا ہے۔ شادی کے بعد اس پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ وہ جب چاہے گی آپ کے پاس آئے گی۔ اسی طرح صباحت بھی۔"

"لیکن مجھے اپنی بیٹیاں شاہ پور میں نہیں بیاہنی اور یہ صرف میری ضد نہیں ہے میری بیٹیاں بھی ایسا نہیں چاہتیں۔ آئی ایم سوری شاہ سکندر حیات!" وہ حتمی انداز میں کہہ کر گھڑی دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہ سکندر اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر بھی خاموش بیٹھے رہے۔

وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے۔ پتا نہیں قصداً انجان بن رہے تھے یا کسی سوچ میں تھے۔

"بارہ بج رہے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ انہیں مخاطب کیے بغیر خود کلامی کے انداز میں بولنے لگی۔

"بچے۔" انہوں نے سوچا اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہی تھی۔ نہ ہی مدیحہ کا سن کر اس تمام عرصے میں اس نے کوئی واویلا مچایا تھا کہ اسے ہر صورت اپنی بیٹی چاہیے۔

"آپ۔" وہ ان کی نظروں سے الجھ کر بس اس قدر کہہ سکی۔

"ہاں چلنا چاہیے۔" وہاں کی صورت گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دروازے کے پاس جا کر ایکدم پلٹ کر اسے مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر آسیہ! میں صباحت اور مدیحہ سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے اس پر آپ کو اعتراض نہیں ہو گا۔ کل تین بجے سہ پہر گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے۔''

وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ یقین سے بولے۔

''میں جانتا ہوں' مدیحہ آپ کے پاس ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل آئے تھے۔

شاہ سکندر واپس علی جہانگیر کے پاس آئے تھے اور اسے اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر انہیں تعجب تو نہیں ہوا پھر بھی ٹوک گئے۔

''تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟''

''میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' علی جہانگیر نے صاف گوئی سے کہا۔

''لیکن میں نے یقین سے تو واپس یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کھانا گرم کروں آپ کے لیے؟'' علی جہانگیر ان کی بات ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں یار! بھوک تو لگ رہی ہے اور بس کھانے کے بعد کافی بھی ضرور پیوں گا۔ گرم وین سے کہنا۔''

''گرم وین نہیں ہے۔ میں بنا دوں گا کافی بھی۔'' علی جہانگیر کہتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا تو انہوں نے آرام سے سامنے ٹیبل پر ٹانگیں سیدھی کر لیں اور اگلے دن کا پروگرام سوچنے لگے جو وہ آتے ہوئے آسیہ سے کہہ آئے تھے کہ کل مدیحہ اور صباحت کے لیے گاڑی بھیج دیں گے۔

''آیئے چچا جان۔'' کچھ دیر بعد علی جہانگیر نے آ کر کہا' تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئے اور کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''تم نے کھانا کھایا یا میرے انتظار میں۔۔۔؟''

''کھا لیا تھا۔'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔

''گڈ!'' شاہ سکندر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

علی جہانگیر بہت توجہ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا' جس پر اب کسی تردد' کسی پریشانی کی لکیر نہیں تھی۔ اس کے برعکس اطمینان جھلک رہا تھا جس سے وہ سمجھ گیا کہ انہیں مدیحہ کا سراغ مل گیا ہے۔

''مدیحہ کہاں کراچی میں ہے نا؟'' قدرے توقف سے اس نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''ہاں!'' انہوں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''کب سے۔۔۔ آئی مین کون چھوڑ گیا ہے اسے؟''

''پتا نہیں۔ یہ ساری تفصیل نہیں پوچھی میں نے۔ مدیحہ سے معلوم کروں گا۔ ہاں' تم کافی بنانے والے تھے۔'' شاہ سکندر اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

''جی۔ آپ چلیں میں لے کر آتا ہوں۔'' وہ فوراً کچن کی طرف بڑھ گیا۔

شاہ سکندر لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنے رہائشی کمرے میں آ گئے اور کپڑے نکالنے کی غرض سے الماری کھول لی لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو بغیر کسی پروگرام کے یونہی چلے آئے تھے۔ یعنی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائے تھے۔

''چچا جان!'' علی جہانگیر نے غالباً کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پکارا تھا۔

''ہاں۔ آ جاؤ۔'' انہوں نے الماری بند کر کے کہا۔

علی جہانگیر اندر آیا تو چھوٹی سی ٹرے میں کافی کے دو مگ تھے۔

''تمہیں صبح آفس نہیں جانا؟'' انہوں نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھ کر بولا۔

''جانا ہے' بس یہ ہے کہ کچھ لیٹ ہو جاؤں گا۔''

''اور اس کا ووٹ دار مجھے ٹھہراؤ گے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا تو علی جہانگیر قدرے جھینپ گیا۔

''نو سر! آپ نے تو نہ مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا اور نہ اپنے ساتھ کافی پینے کی آفر کی۔''

''گویا اپنے ہر فعل کے تم خود ذمہ دار ہو۔''

شاہ سکندر نے کافی کے ایک دو سپ لینے کے بعد سگریٹ سلگائی تھی اور ایک ساتھ دونوں سے شغل کرتے ہوئے پتا نہیں علی جہانگیر کی موجودگی بھول گئے یا قصداً نظر انداز کر رہے تھے۔ کچھ بھی تھا بہرحال علی جہانگیر کے لیے ان کی لاتعلقی خاصی تکلیف دہ تھی۔ تھوڑی دیر ہی وہ خود پر جبر کر سکا' پھر پہلے ذرا سا کھانس کر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا اس کے بعد مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''چچا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر آسیہ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آئی مین میرے اور صباحت کے۔۔۔؟''

''آئی ڈونٹ نو بیٹا! میری ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔'' انہوں نے پہلے سرسری انداز میں کہا پھر غالباً احساس ہونے پر اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''تم فکر نہیں کرو میں انشاء اللہ جلد ڈاکٹر آسیہ سے بات کروں گا۔ اصل میں وہ سب سے زیادہ تمہارے باپ سے متنفر ہیں۔ اگر تم غیر جانبداری سے دیکھو تو وہ حق بجانب ہیں اس لیے میں انہیں زیادہ فورس نہیں کر سکتا۔ البتہ کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ صباحت کی خاطر مان جائیں گی۔''

''آپ صباحت سے ملے؟'' علی جہانگیر نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔

''نہیں کل۔۔۔'' شاہ سکندر اس قدر کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔

❀ ❀ ❀

''جی مما!'' دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکلیں تو آسیہ ایک نظر ان پر ڈال کر ڈائننگ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''آؤ بیٹا! کھانا کھا لیں۔''

''لیکن مما! نبیل بھائی تو ابھی آئے نہیں۔'' صباحت اچنبھے میں گھر کر بولی۔

آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آ گئیں۔

''میں رات تمہیں بتانا بھول گئی۔'' آسیہ ڈونگا اٹھا کر ان دونوں کی پلیٹوں میں سالن نکالتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں بولنے لگی۔ ''اور صبح بھی یاد نہیں آیا ورنہ اسی وقت تم سے کہہ جاتی۔ خیر ابھی کافی وقت ہے۔ تم آرام سے تیاری کر سکتی ہو۔ تین بجے تمہارے پاپا کی گاڑی آئے گی۔ تم دونوں چلی جانا۔''

''کہاں؟'' دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں ملیں گے بہرحال وہ تم دونوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ تم دونوں اب سمجھدار ہو۔'' آسیہ ہنوز سرسری انداز میں کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''اور اگر وہ ہمیں شاہ پور لے گئے؟'' مدیحہ نے فوراً خدشہ ظاہر کیا تو آسیہ ایک دم سر اونچا کر کے اسے

دیکھنے لگی کیونکہ وہ خود بھی اس خدشے سے پریشان تھی لیکن ان پر ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اب جو مدیحہ نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کتنی دیر بعد اس نے دونوں سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کریں گے۔"

"پھر بھی مما۔" مدیحہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ٹوک دیا۔

"فکر کی بات نہیں ہے بیٹا! پھر تم پہلے بھی ان سے مل چکی ہو گی مگر جب...." آسیہ نے دیکھا صباحت گم صم بیٹھی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مما! لیکن انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔" مدیحہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو آسیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"بس ہو گیا معلوم۔ اب تم جلدی سے کھانا کھا کر تیار ہو جاؤ۔ شاہ سکندر کی گاڑی زیادہ دیر تک اس دروازے پر نہیں رکنی چاہیے۔ اوکے۔" آسیہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل گئی۔

"چلو بھئی، جلدی کرو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صباحت نے اسی گم صم انداز میں کہا۔

"کیوں، کیوں نہیں جاؤ گی؟ اب تو مما خود بھیج رہی ہیں ہمیں۔ چلو اٹھو۔ کھانا وانا بھی وہیں کھائیں گے پاپا کے ساتھ۔" وہ زبردستی اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"تو یہ تھی مما کی پریشانی۔ عجیب ہیں مما بھی۔ اگر انہیں پاپا پر اعتبار نہیں ہے تو صاف منع کر دیتیں۔ خیر چھوڑو یہ دیکھو یہ سوٹ تم پہن لو۔ یہ میں۔"

"ہائیں۔" صباحت اچھل پڑی۔ "ہم کسی شادی میں نہیں جا رہے۔"

"تمہیں کیا پتا شاہ پور کی خواتین گھر میں بھی ایسے ہی بلکہ اس سے اچھے اور جھلملاتے ہوئے کپڑے پہنتی ہیں۔" وہ بڑے آرام سے صباحت کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کپڑے استری کرنے کھڑی ہو گئی۔

"تمہاری مرضی لیکن میں یہ نہیں پہنوں گی۔" صباحت نے اپنے لیے دوسرا سوٹ نکال لیا تھا۔

پھر ٹھیک تین بجے وہ دونوں آسیہ سے کہہ کر نیچے اتریں تو اسی وقت گاڑی بھی آ گئی تھی۔

"مدو! اس سے پوچھو، پاپا کہاں ہیں؟" صباحت نے اسے کہنی مار کر ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ! یہ تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟ تمہاری زرد رنگت دیکھ کر تو پاپا، لیکن نہیں، انہیں پتا ہے تم بہت ڈرپوک ہو۔" مدیحہ اس سے کہہ کر فوراً ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"سنو! پاپا اس وقت کہاں ہیں؟"

"جی گھر پر۔" ڈرائیور نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"گھر پر۔" مدیحہ کو پہلا خیال شاہ پور کا آیا جب ہی فوراً پوچھنے لگی۔ "تمہارا مطلب ہے شاہ پور میں۔"

"نہیں جی۔ یہاں گلشن روڈ پر۔"

"اچھا۔" مدیحہ نے پوچھا "اچھا" کو یوں لمبا کھینچا جیسے بہت اچھی طرح واقف ہو پھر صباحت کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہنے لگی۔

"سن لیا۔ ہم منسٹر ہاؤس جا رہے ہیں۔ اب اپنی شکل ٹھیک کرو اور ذرا گردن بھی اکڑا لو۔"

"بکومت۔" صباحت نے دانت پیسے۔ "میری جان پر بنی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"مذاق! میں ہرگز مذاق نہیں کر رہی۔"

"اچھا بس چپ رہو۔"

"انتہائی فضول ہو تم۔" وہ سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد گاڑی بڑے سے سیاہ گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔ تب وہ صباحت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"چلو، تمہیں پاپا سے ملواؤں۔"

"سنو! یہاں صرف پاپا ہی ہیں یا.....؟" صباحت نے اس کے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"مجھے کیا پتا۔ یہ تو اندر جا کر معلوم ہو گا کہ اور کون کون ہے اور کوئی ہو بھی تو ہمیں کیا۔"

"آیئے بی بی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔" ایک باوردی ملازم نے قریب آ کر کہا تو وہ صباحت کا ہاتھ پکڑ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

طویل گیلری کے بعد گول کمرہ تھا۔ وہیں شاہ سکندر موجود تھے۔

"پاپا!" مدیحہ انہیں دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

"کیسے ہو بیٹا!" شاہ سکندر نے اس کی پیشانی چوم لی پھر صباحت کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔

"صبا، آؤ بیٹا!" انہوں نے اپنا بازو اس کی طرف پھیلایا تو وہ بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی اور پھر اگلے ہی پل بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپایا تو اس کے آنسو بھی بے اختیار چھلک گئے تھے۔

"نہیں نہیں بیٹا! روتے نہیں۔" شاہ سکندر نے فرطِ محبت سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تو اسے یوں لگا جیسے طویل مسافتوں کے بعد شجر سایہ دار میسر آ گیا ہو، جس کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ جی بھر کر رو لی تھی۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا پاپا! یہ روتی بہت ہے۔" مدیحہ نے بڑی مشکل سے اسے الگ کر کے بٹھاتے ہوئے کہا تو شاہ سکندر قصداً ذرا سا مسکرائے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولے۔

"اب نہیں روئے گی۔"

"آپ کو نہیں پتا۔ اس کی آنکھوں میں سمندروں جتنا پانی ہے۔"

"سمندروں جتنا۔" شاہ سکندر خاصے محظوظ ہوئے۔ "کیوں بیٹا صبا! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

صباحت نے نفی میں سر ہلا کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی تو شاہ سکندر نے آہستہ سے اس کا سر تھپتھپایا پھر ان دونوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"آپ نے کھانا کھا لیا؟..."

"میں نے تو تھوڑا بہت کھا لیا تھا، البتہ صبا نے بالکل بھی نہیں کھایا۔" مدیحہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"چلو تو پہلے کھانا کھاؤ۔" شاہ سکندر نے کہہ کر ملازم کو پکارا اور اس کے آنے پر ان دونوں کو ڈائننگ ہال میں لے جانے کا کہا۔ پھر مدیحہ کو مخاطب کر کے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"وہ میرا کمرہ ہے بیٹا! آپ دونوں کھانے کے بعد ادھر ہی آ جانا۔"

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" مدیحہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا لنچ ٹائم دو بجے ہے۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

* * *

کھانے کے بعد وہ دونوں شاہ سکندر کے کمرے میں آ گئیں تو کچھ دیر تک وہ ہلکے پھلکے انداز میں ان کی تعلیم، ان کی پسند ناپسند کے بارے میں پوچھتے رہے اور یہ کہ جڑواں ہونے کے ناتے کون سی باتیں اور عادات دونوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مدیحہ سے پوچھا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے ساتھ رہتے پر اپنی مرضی سے گئی تھی یا بابا جان نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور یہ کہ وہ کراچی کس کے ساتھ آئی ہے۔

جواب میں مدیحہ نے انہیں تمام حالات کہہ سنائے۔ وہ بہت متنفر ہو رہی تھی اور برملا اظہار بھی کر رہی تھی۔ درمیان میں کتنی بار صباحت نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کر کے احساس دلانا چاہا کہ اسے شاہ سکندر کا خیال کرنا چاہیے۔ یعنی ان کے سامنے ان کے خاندان کو برا نہیں کہنا چاہیے لیکن وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بھی خاموش نہیں ہوئی تھی۔

شاہ سکندر بظاہر بڑے سکون سے سن رہے تھے اور اس کے خاموش ہونے پر اسی سکون سے بولے تھے۔

"آپ ناحق پریشان ہوئیں اور مجھے بھی پریشان کیا۔ حویلی میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہیں رہ کر آپ کو میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میں کینیڈا گیا تھا یا امریکہ۔ مجھے واپس تو وہیں آنا تھا۔ اس طرح آنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو مجھ پر بھی بھروسا نہیں تھا؟" ان کے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں تنبیہ تھی یا چبھن، مدیحہ کو پہلی بار ان سے بہت ڈر لگا، سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔

"آپ کے اس اقدام سے میری پوزیشن کتنی آکورڈ ہو گئی ہے۔ خود اپنے آپ میں کتنی گلٹی فیل کر رہا ہوں کہ میں اپنی بیٹی کو تحفظ نہیں دے سکا، یہ حیثیت ہے میری.....۔"

"نہیں پاپا!" مدیحہ رو پڑی تو وہ ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگے۔

صباحت کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا کہ جانے اب وہ کیا کہیں اور اگر اس کے معاملے پر بات کرنے لگے تو وہ کیا کرے گی۔

"کم آن بیٹا!" شاہ سکندر نے یکلخت لہجہ بدل لیا اور مدیحہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ "میں تو آپ کو سمجھا رہا تھا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ آئس کریم کیسی تھی؟"

"اچھی تھی۔" وہ روتے لہجے میں بولی۔

"صرف اچھی۔" انہوں نے صباحت کو دیکھا تو وہ فوراً بولی۔

"بہت اچھی۔"

"گڈ! اور اب آپ دونوں میں سے مجھے اچھی چائے کون پلائے گا؟" انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھا تو صباحت نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مدیحہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"صبا، صبا بہت اچھی چائے بناتی ہے۔"

"اور آپ۔"

"میں صرف اچھی۔" اس نے یوں برا سا منہ بنا کر کہا کہ وہ صاف منع کر دیں لیکن وہ موڈ میں تھے۔

"چلو تو آج ہم صرف اچھی چائے پی لیتے ہیں، بہت اچھی پھر سہی۔"

"مجھے پتا تھا آپ یہی کہیں گے۔" وہ مدیحہ کا کام ہو، بہت بے دلی سے اٹھی تھی، مزید صباحت کی مسکراہٹ سے چڑ گئی تو جاتے جاتے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ گئی تھی۔

"اف!" صباحت اپنا بازو سہلانے لگی۔

شاہ سکندر نے قصداً اس کی طرف سے دھیان ہٹا لیا اور اٹھ کر دیوار گیر ریک کا شیشہ کھولا تھا کہ فون کی بیل پر واپس پلٹ کر اسی جگہ آ بیٹھے اور ریسیور اٹھا لیا۔

"یس شاہ سکندر۔"

"او علی! کیسے ہو بیٹا!"

صباحت کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

شاہ سکندر نے پہلے ناسمجھی کے عالم میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر ایک دم سمجھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا جبکہ ادھر کی بات بھی توجہ سے سن کر کہہ رہے تھے۔

"نہیں، میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ البتہ کل میں شاہ پور جانے کا سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی کنفرم نہیں ہے۔"

"ابھی نہیں ابھی نہیں۔ کل آ جانا۔"

"او کے۔ خدا حافظ۔" انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور کچھ دیر جانے کیا سوچنے کے بعد بہت آہستہ سے صباحت کا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

* * *

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا نبیل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی لابی میں آ کر فون کے پاس کھڑے ہو جاتے اور کبھی ٹیرس پر جا کر دور تک دیکھتے۔ اس پیریڈ میں آٹھ بج گئے تو ان کے اضطراب میں خدشات شامل ہو گئے جنہیں وہ کسی طرح دبا نہیں سکے تو آپا کو فون کر دیا۔

"پھوپھو! مدیحہ اور صبا ابھی تک نہیں آئیں؟"

"آ جائیں گی بیٹا!" آپا کے لہجے کے اطمینان نے انہیں مزید مشتعل کر دیا۔

"کب۔ میرا مطلب ہے کب تک آنے کا کہہ گئی تھیں؟ آٹھ تو بج گئے ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب ان کا باپ بھیجے گا تب ہی آئیں گی ناں۔"

"کیا ہو گیا ہے پھوپھو آپ کو۔ آپ نے انہیں جانے کیوں دیا تھا۔ پتا نہیں شاہ سکندر انہیں کہاں لے گئے۔" نبیل نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بھی مصلحتاً شاہ پور کا نام نہیں لیا۔

"کہیں نہیں لے گئے۔ یہیں اسی شہر میں ہیں۔ تم فکر نہیں کرو آ جائیں گی۔" آپا نے پھر خود کو تسلی دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

"میرے خدا!" نبیل ریسیور رکھ کر پھر ٹیرس میں نکل آئے اور ریلنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھے تو ان کی ٹانگیں، مسلسل ٹہلنے کے باعث ان کی اکڑی ہوئی کمر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

"ہمیشہ غلط فیصلے کرتی ہیں پھوپھو۔" چیئر کی بیک سے کمر ٹکاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ اور اس بار تو انہوں نے بتایا ہی نہیں کہ شاہ سکندر بیٹیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید تھک گئی ہیں پھوپھو یا پھر......"

[illegible] کی آواز سے وہ بری طرح چونکے اور ابھی اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ صباحت نے لابی سے پکارا۔

"نبیل بھائی!"

"تھینکس گاڈ۔" انہوں نے گہری سانس کھینچی اور اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے چیئر کی بیک پر سر رکھ لیا۔

"نبیل بھائی۔" دوسری پکار کے ساتھ ہی صباحت سامنے آتی ہوئی بولی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ سو گئے کیا؟"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں لیکن بولے کچھ نہیں۔

"کیا ہوا نبیل بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" صباحت متوحش سی ہو کر آگے آئی اور ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ آہستہ سے اس کی کلائی تھام کر بولے۔

"میں ٹھیک ہوں بالکل! بس ذرا پریشان ہو گیا تھا۔"

"کس بات سے؟" وہ گھبرائی۔

"بس جانے دو۔ تم اپنی سناؤ۔ مل آئیں اپنے پاپا سے؟"

"ہاں نبیل بھائی!" اس کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی جیسے برسوں کی آرزو پوری ہوئی اور ایک جذب کے عالم میں کرسی کے بازو پر دونوں ہاتھ جما کر فرش پر گھٹنے ٹیک گئی تھی۔

"کیسے لگے؟"

"بہت اچھے۔ بہت محبت کرنے والے۔ مجھے لگا جیسے......" مدیحہ کی آمد سے اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ کیونکہ مدیحہ کی آمد خاموشی سے نہیں ہوئی تھی خاصی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

"ہائیں۔ تم یہاں ہو۔ یقیناً نبیل بھائی کو پوری ہسٹری سنا رہی ہو گی۔ بس کرو صبا! سسرال جاؤ گی تو بڑا مسئلہ ہو گا۔ روزانہ بھاگ کر آنا پڑے گا تمہیں۔ نبیل بھائی کو دن بھر کی روداد سنانے کے لیے۔"

"بکواس۔" اسے غصہ آ گیا۔

"میں بک نہیں رہی۔ عرض کر رہی ہوں کہ خدا کی بندی رحم کرو نبیل بھائی پر۔ بے چارے عاجز آ گئے ہوں گے۔ کیوں نبیل بھائی؟"

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جھنجھلا کر بولی۔

"اف آپ کبھی سچ نہیں بولیں گے۔"

"اس لیے کہ تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔" صباحت نے کہا تو نبیل فوراً مداخلت کرتے ہوئے بولے۔

"کیا ہو جاتا ہے تم دونوں کو۔ فضول میں لڑنے لگتی ہو۔ چلو جاؤ چینج کر کے کھانا لگاؤ۔"

"کھانا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔" مدیحہ نے کہا۔

"ہم کھا کر آئے ہیں۔ مما اور نبیل بھائی تو ہیں۔ آپ چلیں نبیل بھائی میں بس ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔" صباحت کہتی ہوئی اندر چلی گئی تو نبیل مدیحہ کو دیکھ کر بولے

"تمہیں روکا نہیں انہوں نے۔" نبیل جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔

"نہیں۔ وہ زیادہ یہاں رہتے کب ہیں۔ آج یہاں ہیں، کل شاہ پور میں ہوں گے۔" وہ انتہائی لاپرواہی سے جواب دے رہی تھی۔

"اور تم سے پوچھا نہیں انہوں نے کہ تم شاہ پور سے کیسے آئیں؟"

"پوچھا تھا اور الٹا مجھ پر ناراض ہو رہے تھے کہ میں اس طرح کیوں آئی۔ مجھے وہیں شاہ پور میں رہ کر ان کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" مدیحہ کو اب اس بات پر غصہ آنے لگا تھا۔

"یعنی سارے حالات سننے کے بعد بھی کہہ رہے تھے کہ میں وہیں رہتی۔ آپ بتائیں میں رہ سکتی تھی۔"

نبیل ذرا سائڈ میں سر ہلا کر پوچھنے لگے۔

"اور صبا کے بارے میں کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے اس کی رخصتی، شادی کی کوئی بات کی۔"

"بالکل بھی نہیں۔ حالانکہ اب انہیں اس مسئلے کو سلجھانا چاہیے۔ ہے ناں؟" اس نے پھر تائید چاہی تو نبیل بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ بے ساختہ بولے تھے۔

"ہاں ہاں۔"

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب علی جہانگیر شاہ پور پہنچا تھا۔ بھوک اور سفر کی تھکان دونوں ہی غالب تھیں۔ پہلے اس نے سوچا چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن خالی پیٹ نیند آنی بھی مشکل تھی۔ اس نے کچن میں جھانک کر دیکھا تو جیراں نظر آ گئی۔

"جیراں! جو بھی کھانا ہو گرم کر کے نکالو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ دروازے میں سے کہہ کر واپس پلٹا اور تیز قدموں سے اپنے پورشن میں آیا تو شاہ جہانگیر کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی جس کا مطلب تھا وہ ابھی سوئے نہیں ہیں۔ اس نے رک کر ان کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ کہا۔

"ابا جی! میں ہوں علی۔"

"علی۔ ہاں اندر آ جاؤ۔" شاہ جہانگیر کے لہجے میں تعجب غالباً اس کی بے وقت آمد پر تھا۔

اس نے ہینڈل گھما کر ذرا سا دروازہ کھولا اور سر اندر کر کے بولا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ خیریت سے تو ہو بیٹا۔"

"جی۔ دعائیں ہیں آپ کی۔"

"آؤ۔ اندر آؤ۔"

"وہ ابا میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگر آپ......"

"ہاں، ہاں جاؤ پہلے کھانا کھاؤ۔ کوئی ہے کچن میں یا سو گئے سب۔" شاہ جہانگیر یوں کھڑے ہو گئے جیسے خود اس کے لیے کھانا گرم کرنے کو تیار ہوں۔

"جیراں ہے ابا اور میں اس سے کھانا نکالنے کا کہہ آیا ہوں۔ آپ بیٹھیں آرام سے میں کھانا کھا کر آپ کے پاس ہی آؤں گا۔ آپ ابھی سو تو نہیں رہے ناں؟"

"نہیں۔" شاہ جہانگیر دوبارہ بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ارادہ صرف منہ ہاتھ دھونے کا تھا لیکن جب آئینے میں خود کو دیکھا تو پھر شاور لے کر ہی نکلا اور ڈائننگ میں جا

کر کھانا کھایا اس کے بعد دوبارہ شاہ جہانگیر کے کمرے میں آیا تو اب وہ باقاعدہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''سوری! میں نے بے وقت آپ کو تنگ کیا۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں بیٹا! میں تو جاگ ہی رہا تھا اور نہ ہو تو تمہاری ماں کو بھی اٹھا دوں۔'' شاہ جہانگیر نے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا وہ فوراً بولا۔

''نہیں امی کو نہیں اٹھائیں۔ مجھے بس آپ سے بات کرنی ہے۔''

''کیا بات؟'' ان کے نپے تلے ہونے پر وہ اپنے آپ میں الجھ کر اور جیسے اکتا کر بولا تھا۔

''کوئی نئی بات نہیں ہے ابا! وہی پرانا قصہ ہے میری شادی کا۔ کیا سوچا ہے آپ نے؟ اگر آپ صباحت کو بہو نہیں بنانا چاہتے تو صاف کہہ دیں میں خود اسے طلاق دے کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔''

''ہائیں۔'' شاہ جہانگیر اچھل پڑے۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو تنگ چھوڑ دو گے؟''

''ہاں چھوڑ دوں گا۔ صرف اسے ہی نہیں آپ سب کو بھی۔ زندگی بھر میری صورت نہیں دیکھ پائیں گے آپ لوگ۔ بس ابھی فیصلہ کر لیجئے۔ صباحت کو بہو بنانا ہے کہ نہیں۔'' اس نے ٹھوس حتمی لہجے میں کہا تو شاہ جہانگیر گڑبڑا گئے۔

''بنا تو چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہے تمہارا اس سے۔ باقی رخصتی کے لیے اس کی ماں نہیں مان رہی تو...''

''کیوں نہیں مان رہی؟'' وہ فوراً بول پڑا۔ ''آپ گئے تھے اس کی ماں کے پاس؟''

''نن... نہیں۔'' شاہ جہانگیر نظریں چرا گئے۔

''جب گئے ہی نہیں تو پھر کیسے کہہ رہے ہیں کہ وہ نہیں مان رہی۔ آپ ایک بار جائیں تو اور بابا جان کے نمائندے بن کر نہیں بلکہ میرے باپ بن کر جائیں۔ اگر آپ کو میری خوشیاں میری زندگی مطلوب ہے تو اس کے لیے آپ کو ان کی چھلانے میں ہچکچانا نہیں چاہیے اور یہ کام تو آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا لیکن آپ منظر سے ہی ہٹ گئے۔''

''نہ ہٹتا تو بات وہیں پہلے مرحلے پر ہی ختم ہو جاتی۔''

''ہاں۔ اس لیے کہ آپ لوگ فیئر نہیں تھے۔ اگر فیئر ہوتے تو آپ کے اندر پہلے مرحلے پر ہی بات ختم ہونے کا خدشہ بلکہ یقین نہ ہوتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شاہ جہانگیر نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں ابا۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں تو سنیں کہ بابا جان کے دل میں آسیہ کے خلاف جو نفرت، بغض اور دشمنی تھی وہ انہیں طلاق دلوانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب ہی تو جب انہیں صباحت کا پتا چلا تو وہ ایک بار پھر ڈاکٹر آسیہ کو زیر کرنے کا سوچنے لگے۔ انہیں میری شادی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ڈاکٹر آسیہ سے بیٹی چھیننا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکے تھے۔ لیکن مدیحہ نے درمیان میں آ کر ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ جس سے وہ اور تلملا گئے اور صباحت کے حصول کے لیے مدیحہ کو استعمال کرنے لگے۔ کہیں کسی مقام پر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ دونوں لڑکیاں ان کا اپنا خون ہیں۔ ان کے ذہن پر صرف آسیہ سوار رہی اور وہ بس اس کے خلاف سوچتے اور پلان بناتے رہے۔ اگر پوتیوں کی محبت میں اور واقعی ان کی بہتری سوچ کر وہ آسیہ سے بیٹی مانگتے تو میں یقین سے کہوں گا کہ وہ بھی انکار نہ کرتیں۔''

''تم نہیں جانتے بیٹا! وہ عورت...''

''عورت ہی ہے نا۔'' وہ فوراً بول پڑا۔ ''جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اسی کی طرح نازک اور ٹیڑھی بھی اگر آرام سے محبت سے سیدھا کرو گے تو سیدھی ہو جائے گی ورنہ ٹوٹ جائے گی اور ٹوٹی ہوئی عورت کو رام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر صرف بکھرتی ہی نہیں بچھ بھی جاتی ہے۔ آپ خدا کے لیے اب بابا جان کے اشاروں پر چلنا بند کریں۔ اپنے ذہن سے سوچیں کیا صباحت اور مدیحہ سکندر چچا کی بیٹیاں نہیں ہیں اور میں...... میں کیا آپ کی اولاد نہیں ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' شاہ جہانگیر مکمل طور پر اس کی گرفت میں آ چکے تھے۔

''پھر کیوں آپ میری خوشی کا خیال نہیں کر رہے؟ مجھے تو اس سارے قصے میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا ہے۔ جیسے میری کوئی اہمیت، کوئی حقیقت ہی نہیں۔''

''نہیں نہیں بیٹا۔''

''کیا نہیں۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں یا میرا خیال کر کے سوچا۔ نہیں، آپ صرف بابا جان کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ان ہی کی زبان بولتے رہے اور ابھی تک وہی کرتے ہیں جو بابا جان کہتے ہیں۔''

''معاف کیجئے گا ابا! میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں جو خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں اور نہ ہی میں مزید انتظار کر سکتا ہوں۔ صباحت میری منکوحہ ہے اور یہ طے ہے کہ ڈاکٹر آسیہ خود اسے لا کر میرے گھر نہیں چھوڑ جائیں گی۔ آپ کو جانا پڑے گا۔ امی اور آپ۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کی ڈور اسی رشتے کے ساتھ بندھی ہے۔''

اس کے آخری جملے پر شاہ جہانگیر منہ کھولے اسے دیکھتے رہ گئے کیونکہ اس نے ان کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی اور وہ ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر پھر کسی وقت پر چھوڑتا ہوا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا بابا۔ اب آپ آرام کریں بہت رات ہو گئی۔''

''تت۔ تم کہاں جا رہے ہو؟'' شاہ جہانگیر نے چونک کر پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔ جاؤں؟'' وہ ہنستا کر مسکرایا۔

''ہاں۔ اور یہ لائٹ آف کرتے جاؤ۔''

''اوکے۔ شب بخیر۔'' وہ لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل آیا۔

دو بج رہے تھے جب اس نے تکیے پر سر رکھا اور اپنی باتوں کو سوچتے ہوئے کچھ ہی دیر میں سو بھی گیا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

کافی دن چڑھ آیا تھا جب عارفہ بیگم نے آ کر اسے اٹھایا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلے حیران ہوا پھر ایک دم یاد آیا کہ وہ رات ہی یہاں آیا تھا۔ فوراً اٹھتے ہوئے بولا۔

''السلام علیکم امی!''

''جیتے رہو! رات کس وقت آئے تھے؟'' عارفہ بیگم نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پوچھا۔

''گیارہ بج رہے تھے شاید۔''

"گیارہ! تمہارے ابا تو بتا رہے تھے دو بجے سوئے ہو تم۔ جب ہی میں نے صبح تمہیں اٹھایا نہیں۔"

"جی آیا تو میں گیارہ بجے تھا پھر ابا کے ساتھ باتوں میں دو بج گئے تھے۔ ابا اٹھ گئے یا سو رہے ہیں ابھی۔"

"وہ تو صبح ہی اٹھ گئے تھے۔ چلو تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمہارے لیے ناشتہ بھجواتی ہوں۔" عارفہ بیگم نے کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہاں بھجوائیں گی۔ نہیں میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ جیراں سے کہئے گا چائے میں دودھ کم ڈالے۔"

کچھ دیر بعد نیچے اتر کر آیا تو بس برائے نام ناشتا کیا۔ اس کے بعد بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ عقب سے شاہ تیمور نے اسے پکار لیا۔

"علی! سنو!"

اس نے پلٹ کر دیکھا پھر قصداً مسکرا کر بولا۔

"ہیلو! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ تم کہاں جا رہے ہو۔" شاہ تیمور نے بہت عجلت سے جواب دے کر پوچھا۔

"یہیں، بابا جان کے پاس۔ آؤ چلو۔" اس نے بہت سادہ سے انداز میں کہا۔

"نہیں تم جاؤ بلکہ بعد میں چلے جانا پہلے میرے ساتھ آؤ۔" شاہ تیمور نے اسی عجلت میں آگے آ کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ حیرت سے بولا۔

"ارے میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جانا کہاں ہے؟"

"تم آؤ تو۔" شاہ تیمور نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ناچار اس کے ساتھ چل پڑا۔

برآمدے میں آ کر شاہ تیمور رک گیا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر رازداری سے پوچھنے لگا۔

"سنو، تم نے مدیحہ کو دیکھا ہے؟"

"ہاں۔!" اس نے بڑے آرام سے اثبات میں گردن ہلائی تو شاہ تیمور یک دم پرجوش ہو گیا۔

"کہاں — کہاں دیکھا ہے؟"

"یہیں اسی گھر میں۔"

"اسی گھر میں! میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔" شاہ تیمور کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"پھر کالج میں۔ ہاں آخری بار میں نے اسے تمہارے ساتھ کالج میں دیکھا تھا۔ کیوں کیا ہوا اسے؟" وہ سارا معاملہ سمجھ کر انتہائی معصوم اور انجان بن گیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" شاہ تیمور مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے اصرار سے پوچھا تو شاہ تیمور کچھ دیر پرسوچ انداز میں اسے دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔

"مدیحہ چلی گئی یہاں سے۔ کسی کو بتائے بغیر۔ کیا تم اس کے گھر سے معلوم کر سکتے ہو کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی؟"

"میں! میرا تو وہاں آنا جانا نہیں ہے۔" اس نے ایک طرح سے معذوری ظاہر کی۔

"آنا جانا نہیں ہے فون تو کرتے ہو گے۔" شاہ تیمور نے بے قراری سے کہا۔

"وہ بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔" اس کے آرام سے کہنے پر شاہ تیمور جھنجلا گیا۔

"عجیب آدمی ہو تم۔ اپنی منکوحہ کو فون نہیں کرتے۔ نمبر بھی ہے تمہارے پاس یا وہ بھی نہیں ہے۔"

"ہے، نمبر ہے۔" وہ اندر ہی اندر اس کی حالت سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

"تو بھائی میرے، میری خاطر ہی فون کر کے مدیحہ کا معلوم کر دو۔" شاہ تیمور نے خوشامد سے کہا۔

"کر تو دوں لیکن فرض کرو اگر مدیحہ وہاں نہیں پہنچی تو میں تو پھنس جاؤں گا۔ سوری یار ایسا کرو مجھ سے نمبر لے لو اور جو معلوم کرنا ہے خود کر لو۔" اس نے پین کے لیے جیبیں ٹٹولتے ہوئے کہا پھر اسے دیکھا۔ "پین ہے تمہارے پاس؟"

"ہاں۔" شاہ تیمور نے جیب سے پین نکال کر اسے دیا تو وہ اس کے ہاتھ پر نمبر لکھ کر بولا۔

"اگر تمہاری بات ہو مدیحہ سے تو میری منکوحہ کو میرا اسلام کہلوا دینا۔"

"صرف سلام۔" شاہ تیمور نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"صرف سلام۔" وہ کھل کر مسکرایا اور اسے ہاتھ ملاتا ہوا اندر آیا تو کچھ دیر بی بی جان کے پاس بیٹھا پھر بابا جان کے کمرے میں آ گیا۔

"السلام علیکم بابا جان!" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔

"آؤ صاحبزادے! ہم کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" بابا جان نے کہا تو وہ بڑھ کر پوچھنے لگا۔

"آپ کو میری آمد کی اطلاع کس نے دی؟"

"صبح تمہارے باپ نے بتایا تھا کہ رات گیارہ بجے تم آئے۔ بغیر کسی اطلاع کے۔"

"کوئی اتنی دور سے تو نہیں آنا ہوتا بابا جان جو پہلے سے پروگرام بتایا جاتا اور یہاں اطلاع کی جاتی۔ بس جب دل چاہتا ہے چل پڑتا ہوں۔ آپ سنائیں کیا مصروفیات ہیں آج کل؟" اس نے اپنی بات سرسری انداز میں کہہ کر ان کی مصروفیات جاننے میں دلچسپی ظاہر کی۔

"ہماری مصروفیات وہی ہیں جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہیں۔ زمینوں کے بکھیڑے پھر تم لوگوں کے مسائل۔ کیا ہوا تمہاری شادی کا۔ کچھ بات بنی؟" بابا جان نے یوں کہا جیسے اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے تھک گئے ہوں۔

"بات بنانے سے بنتی ہے بابا جان! جبکہ ادھر سے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔" اس کی صاف گوئی پر بابا جان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"کیا کوشش کی نہیں کی گئی تھی۔ ہاں ہاتھ پیر نہیں جوڑے کسی نے جا کر۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا بابا جان۔" وہ خاصا جز بز ہوا۔

"پھر کیا مطلب ہے تمہارا، کیا چاہتے ہو تم؟" بابا جان کے لہجے میں طنز تھا جیسے تم مجھے مشورہ دو گے۔

اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی اور پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا کہ اسی پل دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھلا اور شاہ سکندر اندر داخل ہوئے تھے۔

"السلام علیکم چچا جان۔" اس نے سلام میں پہل کی۔

شاہ سکندر سر کے اشارے سے جواب دے کر بابا جان کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" بابا جان نے انہیں جواب دے کر فوراً علی جہانگیر کو دیکھ کر پوچھا۔ "تم دونوں ساتھ آئے تھے؟"

"جی نہیں۔ میں رات کو آیا تھا اور چچا جان شاید ابھی آ رہے ہیں۔" اس نے کہا تو شاہ سکندر آگے آتے ہوئے بولے۔

"شاید نہیں یقیناً۔"

"ہوں۔" بابا جان نے یوں ہنکارا بھرا جیسے ان دونوں کی آمد کو کوئی معنی پہنا رہے ہوں۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے بابا جان؟" شاہ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بابا جان کو ٹوکا تو وہ چونک کر بولے۔

"ہاں بیٹھو۔"

"شکریہ۔" شاہ سکندر نے بیٹھتے ہوئے علی جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ ڈال کر اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا اور قصداً بابا جان کو سنا کر اس سے کہنے لگے۔

"کل میں نے تمہیں اپنے ہاں آنے سے روک دیا تھا تم نے ضرور مائنڈ کیا ہو گا۔ آئی ایم سوری۔ اصل میں اس وقت صباحت اور مدیحہ میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔"

"مدیحہ۔" بابا جان بے اختیار بول کر خاموش ہو گئے تو شاہ سکندر انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی مدیحہ۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا وہ کراچی میں ہے۔ اپنی ماں کے پاس لیکن آپ اسے چھوڑ کر نہیں آئے تھے۔"

"کوئی بھی چھوڑ آیا ہو۔" بابا جان نے اس بات کو قطعی غیر اہم قرار دے کر اپنی طرف سے موضوع ختم کر دیا۔

"کوئی بھی نہیں بابا جان! کوئی بھی نہیں۔" شاہ سکندر ایک دم آپے سے باہر ہو گئے۔ "دکھ تو اس بات کا ہے کہ میری بیٹی کو یہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ کیوں...... کیوں کیا آپ نے اس کے ساتھ ایسا۔ کیسے اکیلا چھوڑ دیا۔"

"شکر کرو قصبے پر چھوڑا، کہیں اور نہیں پہنچا دیا۔" بابا جان کا کھیل ختم ہو چکا تھا لیکن وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔

"ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، لیکن......"

"غلط الزام مت لگاؤ سکندر......" بابا جان زور سے دھاڑے۔ "اگر ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو تم بھی اس بچی کو دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کبھی اپنے ارادے میں ناکام نہیں ہوتے۔"

"ناکامی ہی نے آپ کو بوکھلا دیا ہے بابا جان! جو آپ خونی رشتوں کی پہچان بھی بھول گئے ہیں۔" شاہ سکندر پر ان کے دھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"بکواس بند کرو سکندر! اور چلے جاؤ ہمارے سامنے سے ورنہ......" بابا جان کا اشتعال انتہا کو چھو رہا تھا۔

"ورنہ کیا۔ شوٹ کرا دیں گے مجھے، کرا دیں۔" شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ جو خاموشی سے دیکھ اور

سن رہا تھا ایک دم حرکت میں آ گیا۔

"چچا جان! پلیز چلیں۔"

"نہیں۔ آج دیکھ لینے دو کہ کتنا دم خم ہے ان میں۔" شاہ سکندر کی طرف سے کھلا چیلنج تھا۔

"دم خم دیکھنا چاہتے ہو؟" بابا جان دیوار پر لٹکی بندوق کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھے تھے۔

"اوگاڈ!" وہ واقعی پریشان ہو گیا اور بھاگ کر بابا جان کے سامنے آ کر بولا۔ "خدا کے لیے بابا جان! یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔"

"تم ہٹ جاؤ علی۔" بابا جان نے اسے دھکیلنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس نے ان کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ بابا جان کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں اور اس سے پہلے کہ ان کی کمزوری ظاہر ہوتی وہ بیٹھ گئے اور شاہ سکندر کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے بولے۔

"لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

شاہ سکندر نے اونہہ کے انداز میں سر جھٹکا اور کین کی چیئر کو پیر سے ٹھوکر مارتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو وہ قدرے مطمئن ہو کر بابا جان کے پیروں کے پاس گھٹنے ٹیکتا ہوا بولا۔

"ریلیکس بابا جان، ریلیکس۔" پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ریلیکس کر کے ہی ان کے کمرے سے نکلا تھا۔

❁ ❁ ❁

"صبا!" اس نے صباحت کو پکارتے ہوئے نبیل کے کمرے میں جھانکا تو وہ کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر بولے۔

"یہاں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟" اس نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"نیچے گئی ہو گی۔" اس بار نبیل نے کتاب بند کر کے اسے دیکھا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"نیچے کا کوئی نام ضرور ہونا چاہیے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ نیچے۔ نیچے، اوپر، اوپر، نیچے۔"

نبیل بے ساختہ مسکرائے لیکن بولے کچھ نہیں۔

"کیوں آپ کو عجیب نہیں لگتا؟" وہ نیچے اوپر کی گردان سے جھنجھلا کر ان سے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔"

"اس لیے کہ آپ خود عجیب ہیں۔" وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔" نبیل نے خاصے محظوظ انداز میں تائید کی تو وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"کیا ٹھیک کہا؟"

"یہی کہ میں عجیب ہوں۔" نبیل نے کہا تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھنے کے بعد بولی۔

"نہیں خیر! اتنے عجیب بھی نہیں ہیں۔"

"ہوں تو خیر تھوڑا سا۔" نبیل بھی کبھی ہی اس موڈ میں آتے تھے۔

"تھوڑے سے بھی صبا کی وجہ سے ہیں۔" اس نے کہا تو نبیل حیران ہوئے۔

"ہائیں۔ صبا کی وجہ سے کیوں؟"

"کیونکہ وہ پوری عجیب' بلکہ عجوبہ ہے اور آپ پر تھوڑا بہت اس کا اثر آیا ہے۔"

"اچھا! یہ تم نے نئی بات بتائی۔" نبیل نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے کہا تب ہی فون کی بیل پر وہ انہیں ابھی آئی کہہ کر بھاگ کر فون کے پاس آئی تھی۔

"ہیلو!"

"مدیحہ ہیں؟" دوسری طرف شاہ تیمور تھا۔ جانے آواز بدل کر بولا تھا یا وہ نہیں پہچانی تھی۔

"جی آپ کون؟"

"مدیحہ میں ہوں تیمور۔" شاہ تیمور نے اس بار اسے پہچان کر کہا تو وہ لہک کر بولی۔

"او شاہ تیمور' کیسے ہیں آپ؟"

"کیسا دیکھنا چاہتی ہو تم؟" شاہ تیمور کے جذباتی لہجے پر وہ ایک لحظہ کو ٹھٹکی پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔

"جیسے آپ ہیں۔ ویسے یہ امید کم ہے کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں گی۔"

"ٹھیک ہیں۔ یہ بتاؤ! تم اس طرح کیوں چلی گئیں بغیر بتائے؟" شاہ تیمور کے لہجے میں چور تھا۔ وہ زور سے ہنسی۔

"ہاہاہا۔ آپ کا مطلب ہے مجھے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ کسے آپ کو یا بابا جان کو؟"

"کسی کو بھی۔" وہ اس کی ہنسی سے مزید چڑ ہوا تھا۔

"اچھا' آئندہ خیال رکھوں گی اور کوئی بات؟" اس نے بے نیازی سے کہہ کر پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"مدیحہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟" شاہ تیمور نے ٹوک کر شکوہ کیا۔

"کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" وہ یکدم اجنبی بن گئی۔

"تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" شاہ تیمور نے زور دے کر کہا تو وہ چیخ پڑی۔

"شٹ اپ شاہ تیمور! مجھے اس جال میں پھانسنے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے' تمہارے پورے خاندان سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت۔ سمجھے تم اور آئندہ بھی مجھے فون مت کرنا۔"

اس نے انتہائی غصے سے ریسیور پٹخ دیا اور جیسے ہی پلٹی سامنے نبیل اور صباحت کھڑے نا سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

* * *

"اونہہ محبت! ایسی ہی پاگل احمق ہوں نا میں جو ان کے فریب میں آ جاؤں گی۔ سو بار لعنت بھیجتی ہوں اور اسے جرأت کیسے ہوئی یہاں فون کرنے کی؟" وہ یقیناً غصہ اپنے آپ بول کر نکالنے لگی تھی۔

"افوہ! کچھ ہمیں تو بتاؤ' کون تھا؟" نبیل کے اشارے پر صباحت نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

"وہ شاہ ور شاہ تیمور جسے میں چکر دے کر بھاگی تھی۔" اس نے یوں بتایا جیسے اگر وہ سامنے ہوتا تو اس کا منہ نوچ لیتی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" صباحت نے اس کے غصے سے خائف ہو کر کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ ہونہہ۔"

اس نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر سر جھٹکا تو صباحت نے بے اختیار نبیل کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا تھا۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولے تھے۔

"تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟"

"کیا!" وہ مزید سلگ کر چیخی۔ "آپ کے خیال میں مجھے خوش ہونا چاہیے؟"

"ہے تو خوشی کی بات کہ تمہارے لیے بھی شاہ پور سے......"

"بس نبیل بھائی! خاموش ہو جائیں۔" وہ چیخ کر بولی اور پھر ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"ارے......!" نبیل نے پریشان ہو کر صباحت کو دیکھا تو اس نے اشارے سے اسے چھیڑنے سے منع کیا لیکن نبیل رہ نہیں سکے اور قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"مت بات کریں مجھ سے۔ میں جانتی ہوں' آپ سب مجھ سے تنگ ہیں۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔"

"پاگل ہو تم بالکل! ایسا کیا کہہ دیا ہے نبیل بھائی نے جو تم ان پر ناراض ہو رہی ہو۔" صباحت نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"کیوں یہ شاہ پور والوں کی فیور نہیں کر رہے؟" وہ روتے ہوئے اسی طرح بولی۔

"ہاں نہیں۔ میں نے کب کسی کی فیور کی ہے۔ میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا۔" نبیل نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو یونہی ایک بات کہنے کی۔ بہت برے لگتے ہیں مجھے شاہ پور والے بدتمیز ظالم اور......"

"بس!" نبیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تنبیہی انداز میں کہنے لگے۔ "سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تھیں تو وہیں کے گن گا رہی تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔"

"ہاں نہیں آنا چاہتی تھی۔ بہت بڑی غلطی کی آ کر۔" وہ ہنوز اسی لہجے میں کہتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

شاہ تیمور کے بجائے اب اسے نبیل پر غصہ آ رہا تھا جس کا اظہار اس نے یوں کیا کہ بار بار الماری کھول کر اس کا پٹ زور سے بند کرنے لگی۔

"مدیحہ! کیا کر رہی ہو؟" صباحت نے کمرے کا دروازہ پیٹ کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"نبیل بھائی نہیں ہیں اپنے کمرے میں۔ خواہ مخواہ کیوں الماری توڑ رہی ہو۔" صباحت نے پھر اونچی آواز میں کہا تو اس نے رک کر اس بات پر غور کیا پھر الماری کا کھلا پٹ بہت بے دلی سے بند کرتی ہوئی آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔

"مدحوا" کچھ دیر بعد پھر صباحت نے پکارا تھا۔ "دروازہ کھولو میرے ہاتھ میں چائے ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد اٹھی اور دروازہ کھولتے ہی کہنے لگی۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں نے چائے کے لالچ میں دروازہ کھولا ہے۔ تمہارا بار بار چلانا مجھے برا لگ رہا تھا۔ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

"کوئی تکلیف نہیں، لو چائے پکڑو۔" صباحت اسے ایک مگ تھما کر الماری کی طرف بڑھ گئی تو وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"ٹوٹی نہیں ہے۔"

"تم اسے توڑ کر ہی چھوڑو گی اور ٹوٹ جائے تو اچھا ہے۔ نبیل بھائی آرام سے ہو جائیں گے۔"

"کیوں! جب میں یہاں نہیں تھی تو وہ آرام سے تھے؟" اس نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا کہ صباحت ایک دم پلٹ کر اسے دیکھنے لگی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"نہیں، کوئی بھی آرام سے نہیں تھا۔"

"اچھا۔" وہ بے یقینی کے انداز میں ذرا سا ہنسی۔ "پھر نبیل بھائی یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ اچھا ہے میرے لیے بھی شاہ پور سے ..."

"مذاق کر رہے تھے۔" صباحت فوراً بول پڑی۔

"جی نہیں، وہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔"

"وہ کیا چاہتے ہیں، کاش تم جان سکو۔" صباحت کی دھیمی آواز اس نے سن لی تھی پھر بھی پوچھنے لگی۔

"کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں۔ چلو آؤ نیچے چلتے ہیں۔ میں نے عمر سے کچھ کتابیں منگوائی تھیں، پتا نہیں لایا ہے کہ نہیں۔" صباحت بات بدل گئی۔

"تم جاؤ۔" وہ اس کے بات بدلنے پر چڑ کر بولی اور اس کے جانے کے بعد دھیمی آواز میں ٹیپ آن کر کے لیٹ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

شاہ سکندر آج تیسرے دن بھی حویلی ہی میں تھے۔ لیکن بابا جان سے دوبارہ ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ خود قصداً گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے اندر بھی غصہ بھرا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ بابا جان سے پھر ان کی تلخ کلامی ہو۔ اتنا تو وہ جان گئے تھے کہ بابا جان کو صباحت اور مدیحہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انہوں نے صرف آسیہ کو اپنی ضد بنا رکھا ہے جبکہ خود ان کے پیش نظر ان کی دونوں بیٹیاں تھیں اور وہ صرف باپ بن کر ان کے لیے سوچ رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ بابا جان نے جس طرح اپنی دوسری اولادوں اور ان کی اولادوں کی شادیاں کی ہیں اسی طرح اور اسی شان سے ان کی بیٹی صباحت کو بھی رخصت کرا لائیں۔ اور وہ اس سلسلے میں بابا جان سے سہولت سے بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مدیحہ کے معاملے میں جو ان کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی تھی اس کی وجہ سے خود ان کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ کتنی بار مہر النساء نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار انہوں نے جھڑک کر اسے خاموش کرا دیا تھا اور اس بار تو کمرے سے ہی نکل جانے کو کہا تو وہ بری طرح تپ کر ان کے مقابل آ گئی تھی۔

"شاہ! یہ گھر تو یوں بھی آپ کے لیے سرائے ہے۔ دو ایک دن کے لیے آتے ہیں ان میں بھی اپنے

مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ میرے لیے بچوں کے لیے آپ کے پاس کوئی وقت نہیں؟"

"میرے مسائل الگ نہیں ہیں۔ بچوں ہی کے لیے پریشان ہوں۔" وہ اس کا تپا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر قدرے نرم پڑے لیکن انداز میں ناگواری تھی جیسے بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔

"میں بھی بچوں کی بات کرنا چاہتی ہوں۔" مہر النساء نے کہا تو اس بار وہ کچھ سنبھل کر بولے۔

"کیا بات؟"

"آغا ماشاء اللہ شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے میں شہر بانو کی بیٹی لانے کا سوچ رہی ہوں۔ بی بی جان بھی یہی چاہتی ہیں اور الماس کے لیے ..."

"الماس ابھی چھوٹی ہے۔" وہ بول پڑے۔ "اس کے لیے تمہیں ابھی سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے بہت پڑھانا چاہتا ہوں۔ انٹر میں اچھے مارکس لے آئی تو میڈیکل میں ایڈمیشن کرا دوں گا۔"

مہر النساء نے فوراً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ان کی بات سے متفق ہو کر کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے الماس پڑھے گی لیکن آغا تو زمین جائیداد دیکھنے والا ہو گیا ہے اس کی شادی میں دیر کیوں کریں؟"

"دیر صرف صباحت کی شادی میں ہے۔ وہ بھی بابا جان کر رہے ہیں۔ آج اگر وہ اسے رخصت کرا لائیں تو میں ..."

"اس کی شادی سے ہمارا کیا تعلق؟" مہر النساء نے چڑ کر ان کی بات کاٹ دی۔

"تمہارا ہو یا نہ ہو میرا تعلق ہے۔ اور گو کہ وہ آغا سے چھوٹی ہے، لیکن خود بابا جان نے پہلے اس کی شادی کی بات چھیڑی تھی اور یہ طے ہے کہ جب تک اس کا معاملہ سلجھ نہیں جاتا میں اور کسی بچے کی شادی کا سوچوں گا بھی نہیں۔" شاہ سکندر نے حتمی انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔

"اس کا معاملہ تو ساری زندگی نہیں سلجھے گا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔" مہر النساء نے جل کر کہا تو وہ چیخ پڑے۔

"شٹ اپ مہر النساء۔"

"نہیں خاموش ہو سکتی میں۔ آپ میری اولاد کا حق مار رہے ہیں۔ آپ کا بس چلے تو ساری زمین جائیداد ان ہی دو لڑکیوں کے نام لکھ دیں اور لکھ بھی دیتے اگر میری جگہ عام سی عورت ہوتی۔ میں نے اپنا حق چھوڑا نہ اولاد کا چھوڑوں گی اور سن لیں اس لڑکی کا معاملہ سلجھے نہ سلجھے آغا کی شادی کرنی ہے۔"

شاہ سکندر بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے شعلہ بار نظروں سے اسے چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو بہت ضبط سے بولے تھے۔

"سنو مہر النساء! میں اگر چاہوں تو ابھی بھی اپنا سب کچھ مدیحہ اور صباحت کے نام لکھ سکتا ہوں، کوئی نہیں روک سکتا مجھے لیکن میری صرف وہی دو بیٹیاں نہیں ہیں، تین بچے یہاں بھی ہیں اور میں سب کے لیے ایک جیسا سوچتا ہوں۔"

"ایک جیسا سوچتے ہیں تو پھر آغا کی شادی پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی شادی وہیں ہو گی جہاں تم چاہتی ہو لیکن صباحت کی شادی کے بعد اور اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں۔" وہ ایک دم بابا جان

سے بات کرنے پر آمادہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور جب بابا جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ یہی سمجھے کہ اپنے اس روز کے رویے پر نادم ہو کر آئے ہیں جب ہی چھوٹتے ہی کہنے لگے۔

"تم کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہو سکندر! اور یہ جرأت تم اس لیے کرتے ہو کہ جانتے ہو ہم اپنی اولادوں میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں۔"

شاہ سکندر نے صرف اس لیے انہیں نہیں جھٹلایا کہ اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے تھے۔

"کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو۔" بابا جان نے ان کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا بابا جان۔" وہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے صباحت کے سلسلے میں یہ پوچھنا ہے کہ اس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟ کب تک وہ ماں کے گھر بیٹھی رہے گی؟"

"جب تک اس کی ماں چاہے گی۔" بابا جان نے فوراً کہا تو وہ زور دے کر بولے۔

"اس کی ماں کو چھوڑیں۔ میں اس کا باپ اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میری آگے اور بھی اولاد ہے اور میں صباحت کے فرض سے سبکدوش ہو کر ہی اوروں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ جہانگیر کے ساتھ بیٹھ کر کوئی قریبی تاریخ طے کر لو۔"

"پہلے سارے معاملات میں نے اور جہانگیر بھائی نے طے نہیں کیے تھے۔"

"کسی نے بھی کیے ہوں، تمہیں اب بیٹی رخصت کرنی ہے۔"

"ہاں، لیکن اس طرح جس طرح آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آسیہ سے بیٹی چھینیں گے نہیں بلکہ اس کے گھر سے رخصت کرا کے لائیں گے۔" شاہ سکندر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔

"تو کیا ہم گئے نہیں تھے۔" بابا جان کے اطمینان سے کہنے پر وہ بری طرح سلگ گئے۔

"کیسے گئے تھے؟"

"سکندر! کیا چاہتے ہو تم؟"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور میں آپ کو فورس اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ سارا کھیل آپ نے شروع کیا تھا۔ اگر آسیہ کی طرف سے پہل ہوتی تو میں خود اس سے بیٹیاں چھین لاتا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میرے نزدیک اب سب سے اہم صباحت کی رخصتی ہے اور وہ اسی وقت عمل میں آئے گی جب آپ خود جا کر آسیہ سے بات کریں گے۔" شاہ سکندر حتی الامکان اپنے لہجے پر قابو پا کر بول رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز قدرے تیز ہو گئی تھی۔

بابا جان ان کی آخری بات پر یوں بن گئے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"یہ آسیہ کی ضد نہیں ہے بابا جان!" وہ ان کے انجان بننے پر زچ ہو کر کہنے لگے۔ "وہ تو سرے سے صباحت کو یہاں بیاہنا ہی نہیں چاہتیں۔ آپ جانتے ہیں وہ خلع کا دعویٰ دائر کر چکی تھیں۔ اگر میں درمیان میں نہ آتا تو اب تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر بتائیں آپ کیا کرتے۔ اتنی پلاننگ کے بعد کیا حاصل ہوتا آپ کو۔ الٹا آپ کا وقار مجروح ہوتا اور میں زیادہ عرصہ تک آسیہ کو مزید اقدام سے نہیں روک سکوں گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کے اگلے نوٹس سے پہلے ہی آپ صباحت کو رخصت کرا لائیں۔"

"جب وہ ڈاکٹرنی اسے یہاں بیاہنے کو تیار ہی نہیں ہے تو پھر تم کس حساب سے ہمیں اس کے پاس

جانے پر مجبور کر رہے ہو؟" ان کی پوری بات سننے کے بعد بڑے سکون سے کہا تھا۔

"وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گی۔ مجھے یقین ہے۔" انہوں نے بڑی امید سے کہا۔

"یہ یقین تمہیں اس ڈاکٹرنی نے دیا ہے؟" بابا جان کے مشکوک لہجے نے انہیں بری طرح ہرٹ کیا تھا اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے مزید اگر بابا جان نے ایک لفظ بھی کہا تو وہ پھٹ پڑیں گے۔

"بس بابا جان!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں نے جان لیا کہ آپ کسی قیمت پر صباحت کو رخصت کرانے نہیں جائیں گے۔"

ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جانے کیا تھا۔ بابا جان ایک لمحہ کو ٹھٹکے پھر فوراً بولے تھے۔

"ہم یہاں اس کا استقبال ....."

"نہیں۔" انہوں نے بھی فوراً ٹوک دیا۔ "صباحت یہاں نہیں آئے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بابا جان نے کوشش سے اپنے لہجے کو مضبوط بنایا تھا۔

"اس کی ماں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ٹھیک ہے۔ میں ناحق اسے روکتا رہا۔" وہ بابا جان کی طرف دیکھے بغیر جیسے اپنے آپ سے کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

◉—◉—◉

"مہر النساء! میرا سارا سامان پیک کر دو۔" شاہ سکندر نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مہر النساء کو مخاطب کر کے کہا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

"سارا سامان کیوں؟"

"میں یہ حویلی بلکہ شاہ پور چھوڑ رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ تم اور بچے بھی اگر میرے ساتھ چلو تو مجھے خوشی ہوگی۔" انہوں نے بہت سپاٹ لہجے میں کہہ کر سگریٹ کیس اٹھایا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ پھر لائٹر کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا تو وہ پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"مہر النساء! سنا تم نے میں نے کیا کہا ہے؟" انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا تو وہ چونک کر بولی۔

"ہاں، حویلی چھوڑ رہے ہیں، لیکن کیوں؟"

"میری مرضی۔ تم یہ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی کہ نہیں؟" انہوں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے شاہ آپ کو۔ اگر بابا جان نے کچھ کہہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ حویلی چھوڑ دیں۔ ایسا کریں آپ دو چار دنوں کے لیے شہر چلے جائیں۔ واپس آئیں گے تو بابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔" مہر النساء الٹا انہیں سمجھانے کھڑی ہو گئی۔

"تو تم نہیں جاؤ گی۔" وہ اس کے سمجھانے پر تپ کر بولے اور اونچی آواز میں الماس کو پکار لیا۔

"جی پاپا!" الماس فوراً ہی آ گئی تھی۔

"بیٹا میری الماری میں جتنا سامان ہے، سوٹ کیس میں پیک کر دو۔" انہوں نے الماس سے بات کرتے ہوئے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا۔

"سارا سامان؟" الماس کو حیرت اس بات پر تھی کہ سارا سامان ایک سوٹ کیس میں کیسے آئے گا اور وہ بھی کر یو لے۔

"دو سوٹ کیس لے لو، دو میں تو آ جائے گا ناں..."

"شاید۔" الماس ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی تو انہوں نے قصداً مہر النساء کو نظر انداز کر دیا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر بیڈ پر رکھا پھر دراز کھول کر اس میں سے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں نکال کر بریف کیس میں رکھنے لگے۔

"شاہ! آپ نے بابا جان سے کہہ دیا ہے کہ آپ یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"کیوں؟" وہ سر اونچا کیے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "ان سے کہنا ضروری ہے کیا یا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ مجھے روک لیں گے۔ نہیں مہر النساء! روک تو وہ مجھے پہلے بھی نہیں سکے تھے۔"

"آپ گئے ہی ایسے تھے کہ..."

"اب اس طرح رات کے اندھیرے میں نہیں جاؤں گا۔" وہ فوراً بول پڑے۔

"جاؤ کر دو سارے میں اعلان کہ میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔ جاؤ مہر النساء۔"

مہر النساء ان کے غضب ناک ہونے پر خائف سی ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

"تھینکس۔" انہوں نے سر جھٹکا تب ہی الماس ڈریسنگ سے نکل کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا پاپا؟"

"کچھ نہیں بیٹا! تم اپنا کام کرو۔ اور ہاں سنو، اسٹڈی میں رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں جتنی ڈائریاں ہیں وہ سب سوٹ کیس میں رکھ دو۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں پاپا! میرا مطلب ہے کیا بہت زیادہ دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟" الماس نے قدرے الجھ کر پوچھا تو وہ اسے دیکھنے لگے جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ کیا جواب دیں۔ پھر اسے قریب بلا کر پوچھنے لگے۔

"تم چلو گی میرے ساتھ؟"

"کہاں؟"

"کراچی۔ میں نے مستقل وہیں سکونت کا فیصلہ کر لیا ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

"امی بھی جا رہی ہیں؟"

"میں نے تو ان سے چلنے کو کہا ہے آگے ان کی مرضی۔" وہ کہہ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو الماس کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگی۔

"پاپا! اگر امی نے انکار کر دیا تب بھی آپ جائیں گے؟"

"ہوں۔" انہوں نے پہلے مصروف انداز میں جواب دیا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ "بیٹا! جیسے تم میری بیٹی ہو اسی طرح صباحت اور مدیحہ بھی ہیں۔"

"تو آپ ان کے لیے جا رہے ہیں؟" ان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ الماس بول پڑی تھی۔

"ہاں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم سے غافل ہو جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔" وہ بریف کیس بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "چلو بیٹا! جلدی سے پیکنگ کر دو مجھے ابھی جانا ہے۔"

الماس بے دلی سے [illegible] ڈریسنگ روم میں چلی گئی تو وہ بی بی جان سے ملنے کے ارادے سے نیچے آئے تو لاؤنج ہی میں بی بی جان کے ساتھ بابا جان اور مہر النساء کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان کے خلاف محاذ کھل چکا ہے اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھے لیکن ہارنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

"مجھے اجازت دیجئے بی بی جان۔"

بی بی جان کچھ گھبرا کر بابا جان کو دیکھنے لگیں تو وہ آگے آتے ہوئے بولے۔

"تو مہر النساء ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس [illegible] کے لیے تم ہمیں، اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

شاہ سکندر ان کے [illegible] کہنے پر بری طرح تلملا گئے تھے۔

"بابا جان۔ اگر آپ ہار جیت کا کھیل کھیل رہے تھے تو مان لیں کہ آپ ہار گئے کیونکہ اس عورت کو میری زندگی سے بے شک آپ نے نکال دیا لیکن اپنے ذہن سے کبھی نہیں نکال سکے۔ وہ ہمیشہ آپ کے لیے چیلنج بنی رہی حالانکہ اس نے کبھی آپ کو چیلنج نہیں کیا۔ بہرحال آپ سن لیں۔ میں اس کے لیے جا رہا ہوں یا کسی اور کے لیے۔ اپنے بال بچوں کو نہیں چھوڑ رہا۔ مہر النساء سے میں پہلے چلنے کو کہہ چکا ہوں۔ لیکن اسے جانے کس بات کا زعم ہے۔ شاید سمجھتی ہے کہ پہلے کی طرح..."

وہ گزشتہ باتیں دہرانا نہیں چاہتے تھے اس لیے سر جھٹک کر خاموش ہو گئے۔

بابا جان کو ان کی اگلی بات نے گویا آسمان سے زمین پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد اتنی دیر انہیں اپنی تمام حیات پر قابو پانے اور خود کو سہارا دینے میں لگی تھی۔ پھر بھی جب بولے تو آواز میں وہ دبدبہ تھا کہ گرج۔

"ہماری اولاد ہی ہمارے خلاف ہو گئی سکندر! تو ہم کسی اور کو کیا کہیں؟ تم جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ ہم کبھی جھک سکتے ہیں نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور ہارنا تو ہماری لغت ہی میں نہیں ہے اور یہ بھی سن لو کہ ہم ہار جیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے۔ ایسے کھیل ہم اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہمیں صرف تمہاری بیٹیوں کا خیال تھا اور ابھی بھی ہے۔"

"بہت شکریہ بابا جان! آپ جتنا ان کا خیال کر سکتے تھے کر لیا۔ اب وہ میری ذمے داریاں ہیں۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بی بی جان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو تمہیں اپنی ذمے داریوں کا احساس تو ہوا۔" بابا جان نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ بھی ان ہی کے انداز میں بولے۔

"دیر آید درست آید۔ اب یقیناً میں ان کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکوں گا۔"

"یقیناً لیکن یہ کبھی مت بھولنا کہ ہم شاہ ہیں اور شاہوں کی بیٹیاں شاہوں میں ہی بیاہی جاتی ہیں۔" بابا جان نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی [illegible] اور وہ سمجھ کر کہنے لگے۔

"یہ اصول آپ کے ہیں بابا جان! آپ کے۔ وہ جو شاہوں کے شاہ ہیں جنہیں کل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا انہوں نے انسانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے والے سارے تفرقے مٹا ڈالے تھے۔ ذات پات، حسب نسب، گورا کالا، یہاں تک کہ عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے بابا جان! کہ آپ اپنی نسبت کو ان ہی سرکار دو عالم ﷺ سے جوڑ رہے ہیں لیکن ان کی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہے۔"

"جاؤ سکندر! ہمیں تم سے کوئی [illegible] نہ تمہارے کسی معاملے سے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

جان لاجواب ہو کر رہ گئے تھے اور کچھ بھی نہیں۔ فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔

شاہ سکندر کچھ دیر ان کے پیچھے دیکھتے رہے۔ پھر دوبارہ بی بی جان کے پاس بیٹھتے ہوئے مہر النساء کو مخاطب کر کے بولے تھے۔

"مہر النساء ادھر دیکھو الماس نے میرا سامان پیک کر دیا۔ اس سے کہو جلدی کرے میں شام اترنے سے پہلے یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"شام تو ہو جائے گی شاہ! مجھے اپنا سامان اکٹھا کرتے کرتے۔"

❁......❁......❁

وہ جب سے شاہ جہانگیر کو اپنے حق میں ہموار کر کے کراچی آیا تھا تب سے صباحت سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ادھر کا شاید فون خراب تھا جو مسلسل بیل بجتی تھی اور کوئی اٹھاتا نہیں تھا۔ وہ صبح شام اور آفس میں بھی جب اسے موقع ملتا اس کے نمبر ڈائل کرتا اور پھر مایوس ہو کر اپنی قسمت کو کوسنے لگتا کیونکہ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ جب ہی ایک طرف کچھ حالات بہتر ہوتے ہیں تو دوسری طرف پہلے سے زیادہ خراب، بہر حال اسے شاہ پور سے آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور شاہ جہانگیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زمینوں کے کچھ کام نمٹا کر ہفتہ دس دن کے بعد اس کی ماں کو لے کر اس کے پاس آئیں گے۔ پھر جیسا وہ کہے گا ویسا کریں گے اور اس نے سوچ لیا تھا کہ انہیں آسیہ کے پاس بھیجے گا اور یہ اس کی طرف سے آخری کوشش ہوگی۔ آسیہ مان گئی تو ٹھیک دوسری صورت میں وہ خود صباحت کو طلاق دے کر یہ سارا قصہ ختم کر دے گا کیونکہ اس سے زیادہ وہ اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا تھا اور یہی بات وہ صباحت سے کہنا چاہتا تھا۔

اس وقت اس نے بہت بے دلی سے ٹیلی فون سیٹ قریب کھینچ کر نمبر ڈائل کئے اور دوسری طرف کی بیل سننے لگا۔ خلاف توقع دوسری بیل پر ہی ریسیور اٹھنے کے ساتھ تیز آواز آئی تھی۔

"ہیلو!"

"کون مدیحہ؟" فوراً سید حا پوچھا تھا۔

"جی آپ کون؟" مدیحہ کا وہی لٹھ مارنے والا انداز تھا۔ وہ گہری سانس کھینچنے کے بعد بولا۔

"علی۔"

"علی کیسے ہیں آپ؟"

"تم سناؤ، خیریت سے پہنچ گئیں اپنی بہن کے پاس۔" وہ فوراً ہی صباحت کا ذکر لے آیا تو ادھر وہ بڑی زور سے ہنسی تھی۔

"سیدھے سیدھے کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو صبا کی خیریت مطلوب ہے تو جناب وہ بالکل ٹھیک ہے اور میں آپ کی خیریت بھی اس تک پہنچا دوں گی۔"

"نہیں۔ تم بس اتنی زحمت کرو کہ اسے بلا دو۔" اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا۔

"کیوں، کیوں بلا دوں؟"

"مدیحہ پلیز۔" وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن اس کی عادت سے بھی واقف تھا اس لیے بہت لجاجت کا مظاہرہ کیا۔

"بس بس۔ زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے فوراً ٹوک کر وہیں سے صباحت کو پکار کر

کہا تھا۔ "صبا تمہارا فون ہے۔"

وہ دوسری طرف کی تمام حرکات و سکنات یوں محسوس کر رہا تھا گویا دیکھ رہا ہو۔

"ہیلو!" چند لمحوں بعد صباحت کی آواز سن کر وہ مطمئن سا ہو کر بولا تھا۔

"صبا! میں ہوں علی۔"

"جی ـــ" وہ غالباً گھبرا گئی تھی۔

"سنو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟" وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے بھی نظر انداز کر گیا۔

"مشکل ہے۔" صباحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تو وہ دبے لہجے میں چیخ پڑا۔

"ناممکن تو نہیں ہے ناں۔"

"نہیں ناممکن تو شاید کبھی نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں آزردگی سمٹ آئی تھی جسے محسوس کر کے وہ نرم پڑ گیا۔

"چلو جانے دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا لیکن خدا کے لیے اب ڈرنا چھوڑ دو۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ میں بہت جلد اپنے امی ابا کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔ انہیں وہاں سے مایوس نہیں لوٹنا چاہیے، سمجھیں تم۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"بس صبا! میں اب یہ نہیں سننا چاہتا کہ تم نے سارا اختیار اپنی ممّا کو دے رکھا ہے اور وہ جو چاہیں فیصلہ کریں۔ ان کا فیصلہ اب بھی وہی ہوگا۔ وہ اور بابا جان ہمارے لیے نہیں سوچتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ پھر ان کے فیصلے پر سر جھکانے کا مطلب۔ یہ سراسر اپنی ذات کے ساتھ ظلم ہے صبا! میری بات سمجھ رہی ہو ناں اور یہ بھی سن لو کہ یہ میری آخری کوشش ہے اگر میرے امی ابا تمہارے گھر سے مایوس لوٹے تو پھر واقعی ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے اور اس کا ذمہ دار میں سب سے زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گا اور کبھی معاف نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔"

اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی ریسیور رکھ دیا کیونکہ اس کا رونا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کمزور پڑنے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اس کی بزدلی پر کڑھتا رہا پھر اپنا دھیان ہٹانے کے لیے باہر نکلا تو رات گئے تک سڑکوں پر ہی گاڑی دوڑاتا رہا تھا۔ حقیقتاً وہ بے حد مضطرب تھا اور بے حد مایوس۔ شاید اس مقام سے بھی آگے نکل آیا تھا جہاں انسان کے اندر کسی معجزے کے رونما ہونے کی ایک آخری امید زندہ رہتی ہے۔ اس کے اندر وہ بھی کوئی ٹی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ شدت سے محسوس کرتا ہوا وہیں لاؤنج میں سونے پر دراز ہو گیا تھا۔

صبح نہ تو معمول کے مطابق خود سے اس کی آنکھ کھلی اور نہ کرم دین کے اٹھانے پر اٹھا تھا۔ بس ذرا سی آنکھیں کھولیں اور اسے جانے کا اشارہ کر کے دوبارہ سو گیا تھا۔ اس کے بعد کرم دین نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب اسے اپنے سر پر شاہ جہانگیر کی آواز سنائی دی تو نیند میں ہونے کے باعث پہلے وہ یہی سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن دوسرے پل عارفہ بیگم اس کا بازو ہلا کر پکارنے لگیں۔

"علی، علی خیر تو ہے۔ ابھی تک سو رہے ہو اور یہاں!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے کے بعد سلام کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ کب آئے؟"

"ابھی آ رہے ہیں۔" شاہ جہانگیر کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ "تمہیں کرم دین نے نہیں بتایا۔

رات میں نے فون کیا تھا۔"

"وہ۔۔۔ میں اصل میں دیر سے آیا تھا۔ آپ بیٹھیں میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔" وہ ان کے مزید دیر سے آنے اور اتنی دیر تک سونے سے متعلق سوالوں سے بچنے کی خاطر منہ دھونے کے بہانے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور پہلے آفس فون کر کے اپنے نہ آنے کا بتایا پھر وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔

نہانے سے وہ کافی ہلکا پھلکا تو ہو گیا تھا لیکن مایوسی کا ابھی بھی وہی عالم تھا۔ شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کی آمد نے بھی کوئی امید نہیں جگائی تھی پھر بھی وہ آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی ملال نہ رہے۔

"ہاں تو کیا کہتے ہو تم۔ ہم آسیہ کے پاس جائیں۔" وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو شاہ جہانگیر نے اصل بات چھیڑ دی۔

"جی۔۔"

"جانے کو تو ہم تیار ہیں لیکن بابا جان کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانتے ہو وہ۔۔۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ سکندر یہاں آنے کے بعد کیا کہتا ہے؟" شاہ جہانگیر نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ سمجھا نہیں۔

"تمہارے چچا سکندر، وہ ادھر ہی آ گئے ہیں ناں، اپنے بال بچوں کو لے کر۔ تمہیں پتا نہیں ہے؟" عارفہ بیگم نے بتا کر اس کی لاعلمی پر تعجب کا اظہار کیا۔

"چچا جان فیملی کے ساتھ یہاں آ گئے ہیں۔ کب؟" اس کی حیرت میں الجھن بھی تھی اور سوچ بھی۔

"ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں آسیہ سے پہلے اس کے پاس جانا چاہیے کیونکہ بیٹی تو ان کی بھی ہے۔ پھر اگر وہ کہے گا تو ہم ادھر بھی چلے جائیں گے۔" شاہ جہانگیر اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ فوراً تائید کرے گا لیکن اس کا ذہن شاہ سکندر میں الجھ گیا تھا۔ اس لیے ان کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔

"آپ چھوڑیں نا سکندر کو۔ بس جہاں علی کہتا ہے وہیں چلتے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد کی خوشی دیکھنی ہے۔" عارفہ بیگم اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھی تھیں۔

"اسی کی خوشی کی خاطر تو یہاں آیا ہوں۔ بتاؤ ناں علی۔ کیا کہتے ہو تم؟" شاہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا تو وہ ذرا سا چونکا پھر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ جو آپ کا دل چاہے کریں۔"

"کیا۔۔۔ کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بابا جان نے کچھ کہا ہے تم سے یا سکندر نے تمہیں بتاؤ کیا بات ہوئی ہے۔"

"میرے ساتھ کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ بتائیں چچا جان فیملی کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں۔ میرے سامنے تو انہوں نے بابا جان سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"ہمیں تو نہیں پتا بیٹا۔ اس دن میں تمہارے ہاں آیا تو معلوم ہوا سکندر حویلی چھوڑ گیا ہے اور میرا خیال ہے اس بچی کی شادی کے لیے مجبوری ہو گی اس لیے میں کہہ رہا ہوں پہلے اس کے پاس چلتے ہیں، ہو سکتا ہے اس کا آسیہ کے ساتھ اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہو۔"

شاہ جہانگیر نے اس کے دیکھنے پر وضاحت کی تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہوں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ چچا جان کے پاس جائیں۔"

"ہم جائیں! تم نہیں چلو گے؟" شاہ جہانگیر نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔

"نہیں۔ میں کیوں جاؤں' اپنا رشتہ لے کر کیا میں گیا تھا؟" اس نے روٹھے لہجے میں کہا تو عارفہ بیگم فوراً اس کی تائید کرتی ہوئی بولیں۔

"ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ یہ کیوں جائے گا؟ اسے تو بس اب سہرا باندھ کر ہی لے جائیں گے۔"

"انشاء اللہ۔ اچھا بیٹا پھر ہم چلتے ہیں۔" شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔

"اس وقت کہاں جائیں گے۔ کھانے کے بعد۔"

"کھانا ہم سکندر کے ساتھ کھائیں گے۔ چلو عارفہ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

❁ ❁ ❁

شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو دیکھ کر شاہ سکندر کا ٹھٹکنا فطری بات تھی اور انہیں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ بابا جان نے ایک بار پھر ان کے خلاف سازش کر کے انہیں بھیجا ہے۔ اس لیے انہوں نے مروتاً بھی ان کی آمد پر خوشی کا اظہار نہیں کیا اس کے برعکس خاصا لیا دیا انداز تھا۔

"کیسے آئے آپ لوگ؟"

"برا لگا ہمارا آنا؟" شاہ جہانگیر فوراً ہی ان کی بے اعتنائی محسوس کر گئے تھے۔

شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ بیگانے پن کا بھی مظاہرہ کر گئے تو شاہ جہانگیر نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"میں جانتا ہوں سکندر، تم کیا سوچ رہے ہو۔ خدا گواہ ہے بابا جان نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں تمہارے پاس۔ اپنے بیٹے کی خوشیاں مانگنے اور میں تو بہت پہلے تم سے مانگنا چاہتا تھا لیکن تمہارا اصرار تھا کہ بابا جان آسیہ کے پاس جائیں۔ مجھے تو کسی نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ بابا جان نے نہ تم نے۔ حالانکہ علی کا باپ میں ہوں۔ بہر حال ان ساری باتوں سے قطع نظر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنی چاہئیں۔ آخر ان کا کیا قصور ہے؟"

شاہ سکندر آہستہ سے اپنے کندھوں سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولے۔

"یہی تو میں پوچھتا رہا کہ میری بچی کا کیا قصور ہے؟ اس کے لیے بابا جان اس طرح کیوں نہیں سوچتے جیسے دوسری اولادوں کے لیے سوچتے ہیں۔"

"دوسری اولادوں کے لیے سوچتے ہوئے بھی وہ ان کی خوشی کا خیال کب کرتے ہیں۔ وہ تو زبردستی اپنے فیصلے مسلط کرنے کے عادی ہیں اور جو ذرا سا ان کے فیصلے سے اختلاف کرتا ہے اسے وہ اپنی ضد بنا لیتے ہیں۔ لیکن خدا کے لیے سکندر تم اس بات کو ضد مت بناؤ کہ بابا جان ہی صباحت کو رخصت کرانے جائیں گے۔"

"نہیں، میرا اب بابا جان سے کوئی تعلق نہیں اور جہاں تک صباحت کی رخصتی کا سوال ہے تو اس کا فیصلہ اس کی ماں کرے گی اور مجھے نہیں معلوم اس کی ماں نے کیا سوچا ہے؟" شاہ سکندر صاف دامن بچا گئے۔

"ہم اسی لیے تمہارے پاس آئے ہیں کہ تمہاری اجازت سے ہم آسیہ کے پاس جانا چاہتے ہیں۔" شاہ جہانگیر ان کے پہلو تہی کرنے پر اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولے تھے۔

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جب آپ کا دل چاہے جائیں۔"

پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر معذرت کر کے اپنے کسی کام سے چلے گئے تھے۔

عارفہ بیگم، مہرالنساء کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں تو شاہ جہانگیر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ انہیں شاہ سکندر کے رویے نے خاصا مایوس کیا تھا اگر علی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یہیں سے واپس شاہ پور لوٹ جاتے لیکن انہیں علی کی بات یاد تھی جو اس نے کہا تھا۔ "میری زندگی کی ڈور اسی رشتے سے بندھی ہے۔" اسے مضبوط کرنے کے لیے وہ اب اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے رویے سے دلبرداشتہ ہونے کے باوجود ٹھیک چار بجے عارفہ بیگم کے ساتھ آسیہ کے دروازے پر موجود تھے۔

کل کے جواب میں گیٹ ثوبیہ نے کھولا تھا اور وہ عارفہ بیگم کو پہچانتی تھی اس کے باوجود فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا بلکہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

"ڈاکٹر صاحب ہیں یا ان کے والد صاحب۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔" شاہ جہانگیر نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا تو وہ گیٹ اسی طرح کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔

عارفہ بیگم یوں شاہ جہانگیر کو دیکھنے لگیں جیسے بڑی بے عزتی ہوگئی۔

"اولاد کی خاطر عارفہ بیگم! بہت کچھ سہنا پڑتا ہے اور پھر شروعات تو ہماری طرف سے ہوئی تھیں۔ اب جو وہ کہیں چپ چاپ سننا ہے۔" شاہ جہانگیر ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر آواز دبا کر بول رہے تھے تب ہی ابا جی نے آ کر پورا گیٹ کھول دیا۔

"السلام علیکم۔" شاہ جہانگیر بس ایک نظر اس بوڑھے شخص کو دیکھ سکے پھر سر جھک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آیئے۔" ابا جی اگر خندہ پیشانی سے نہیں ملے تو پیشانی پر بڑھاپے کی عطا کردہ شکنوں میں کسی ناگوار شکن کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔

"شکریہ!" شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور ان کے پیچھے ابا جی کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو انہیں اچانک وقت بہت پیچھے لے گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر سب لوگوں کے چہرے کھل گئے تھے اور وہ سب کے درمیان رابطہ اندر بنے سب کو حیران کر رہے تھے۔ اب خود حیران تھے کہ زندگی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔

"آپ بیٹھیں میں آسیہ کو بلاتا ہوں۔" ابا جی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو عارفہ بیگم ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگیں۔

"شاہ جی! آپ کو کیا ہوا؟"

"ہیں۔" وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

"بیٹھ جائیں۔ وہ آسیہ کو بلانے گئے ہیں۔"

"ہاں۔" انہوں نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر بیٹھنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں برسوں پہلے بیٹھے تھے لیکن کتنا فرق تھا تب اور اب میں۔ جو گردن غرور سے تنی تھی اسے وقت نے جرم کا احساس دے کر جھکایا تھا۔

کتنی دیر ہوگئی۔ ابا جی آئے نہ آسیہ نہ کسی اور نے جھانک کر دیکھا تھا۔

عارفہ بیگم پہلو پر پہلو بدلنے لگی تھیں۔ کسی وقت بڑبڑانے بھی لگتیں۔ لیکن شاہ جہانگیر ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ وہ مسلسل اپنا محاسبہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ابا جی آسیہ کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت مجبور کرنے پر

آئی ہے۔ شاہ جہانگیر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور عارفہ بیگم بھی اٹھنے لگی تھیں کہ آسیہ نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"پلیز! تشریف رکھیں۔"

شاہ جہانگیر بیٹھ گئے تو پوچھنے لگی۔

"کیسے زحمت کی آپ نے؟"

"ہماری آمد کا مقصد آپ جانتی ہیں۔" شاہ جہانگیر کو حقیقتاً بولنے میں دقت ہوئی تھی۔

"جی نہیں' میں بالکل نہیں جانتی۔" وہ رکھائی سے بولی تو ابا جی فوراً کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ یقیناً صباحت کے لیے آئے ہیں۔"

"جی' جی صباحت بیٹی کے لیے۔ ہمیں آنا تو بہت پہلے چاہیے تھا لیکن۔" شاہ جہانگیر کوئی بات نہیں بنا سکے تھے۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنی ساری چالوں میں ناکام ہونے کے بعد۔" وہ زہر خند سے بول رہی تھی کہ ابا جی نے ٹوک دیا۔

"آسیہ! انہیں گھر آئے مہمانوں کا خیال کرنا چاہیے۔" پھر ان دونوں کو دیکھ کر بولے تھے۔ "آپ اس کی باتوں کا برا نہیں مانیے گا۔"

"جی نہیں' انہیں حق ہے۔ چاہیں تو ہمیں گھر سے ہی نکال دیں۔ لیکن اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" آسیہ نے ہونٹ بھینچ لیے کیونکہ ابا جی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"اس سے پہلے جو کچھ ہوا' اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔" شاہ جہانگیر نے اپنا رخ ابا جی کی طرف موڑ کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تو آسیہ ہونہہ کے انداز میں سر جھٹکتی ہوئی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

اس کے پیچھے پردہ ہل رہا تھا۔ باقی سب ساکت ہو گئے تھے۔

"ہمیں اجازت۔" کتنی دیر بعد شاہ جہانگیر غالباً کہنا کچھ اور چاہتے تھے اور کہہ کچھ گئے تو بوکھلا کر وضاحت کرنے لگے۔ "ابھی ڈاکٹر صاحب کا موڈ ٹھیک نہیں ہے، ہم پھر آجائیں گے۔"

"ہاں! لیکن چائے۔ چائے آرہی ہے۔" ابا جی کو فوراً ہی بات سمجھ میں آئی اور وہاں سے اٹھنے کا بہانہ بھی مل گیا تھا۔

"اب کیا کریں شاہ جی! ڈاکٹرنی تو بات سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔" ابا جی کے کمرے سے نکلتے ہی عارفہ بیگم تشویش سے بولیں۔

"صبر کرو۔ اس کے ابا جی سے بات کرتا ہوں، وہ اسے سمجھا لیں گے۔" شاہ جہانگیر خود بھی فکرمند تھے لیکن بیگم پر ظاہر نہیں کر رہے تھے۔

آسیہ جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو دھکے دے کر نکال باہر کرے۔

ابا جی نے انہیں اندر کیوں آنے دیا۔ کیا وہ بھول گئے کہ مجھے تباہ کرنے والا یہی شخص ہے؟ وہ بھول سکتے ہیں لیکن میں نہیں بھول سکتی۔ کیسے بھول جاؤں اتنے برسوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں جب میرے دل کی بستی نے اپنے اجڑنے کا ماتم نہ کیا ہو۔

کس نے دیکھا وہ لہو جو قطرہ قطرہ میرے دل سے ٹپکتا رہا۔
کس نے دیکھے وہ آنسو جو شب تنہائی میں میری آنکھوں سے تکیے میں جذب ہوتے رہے۔
کسی نے نہیں دیکھے جب ہی میری بیٹی کو اسی راستے پر دھکیلنا چاہتے ہیں۔

وہ سلگتے ذہن کے ساتھ جانے کیا کچھ سوچتی ہوئی ریلنگ کے قریب رک کر نیچے دیکھنے لگی۔ شاہ جہانگیر کی گاڑی موجود تھی جس سے وہ مزید سنگ کر واپس مڑی اور مدیحہ کو نیچے بھیجنے کے خیال میں اس کے کمرے تک آ کر اسے پکارنا چاہتی تھی کہ اندر سے آتی اس کی تیز آواز سن کر رک گئی۔ وہ صباحت پر ناراض ہو رہی تھی۔

"تم انتہائی احمق پاگل ہو اپنے آپ میں گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے، مما سے کہہ دو کہ تم علی کو پسند کرتی ہو یا پھر میں کہہ دوں گی۔"

"نہیں مدحو! تمہیں میری قسم۔ تم مما سے کچھ مت کہنا۔" صباحت کی منت بھری آواز آئی تھی۔

"کیوں۔ کیوں اتنا ڈرتی ہو؟ مما تمہیں جان سے تو نہیں مار دیں گی۔"

"میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ مجھے بس مما کو دکھ نہیں دینا۔ کرنے دو انہیں جو فیصلہ کرتی ہیں۔ میں بھول جاؤں گی علی جہانگیر کو۔ میرا یقین کرو میں نے اپنے دل کی بستی میں اس کے نام کے جتنے پھول کھلائے تھے سب اپنے ہاتھوں سے نوچ ڈالوں گی۔ پھر تم دیکھنا کبھی نہیں روؤں گی۔" آنسوؤں کے درمیان صباحت رک رک کر بول رہی تھی۔

"نہیں۔" آسیہ نے دروازہ دھکیلنے کے لیے جو ہاتھ اٹھا رکھا تھا وہ بے اختیار اپنے سینے پر رکھ لیا تھا، آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بہت دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا اور بستر پر ڈھے گئی۔ اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ عجیب سی بے بسی طاری ہو رہی تھی اس پر۔ آنکھیں ابل جلنے لگی تھیں۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے تو ذہن کے دریچوں پر اس کے اپنے الفاظ دستک دینے لگے تھے۔

"میرا دل پھولوں کی بستی ہے۔ اسے اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے، میری زندگی سے پیار نہ ہو۔" اس نے شاہ سکندر سے کہا تھا۔

اور اسے لگا جیسے اس کی بگڑی صباحت آن کھڑی ہوئی ہو۔

"نہیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ "دل کی بستی اجڑ جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ ایک درد مسلسل جو جینے دیتا ہے نہ مرنے ایسی کڑی سزا میں اپنی بیٹی کو نہیں دوں گی۔"

"صبا!" اس نے یوں پکارا جیسے وہ سامنے کھڑی ہو۔ پھر کمرے سے نکلی تو پہلے ریلنگ کے پاس جا کر نیچے جھانک کر دیکھا۔ شاہ جہانگیر کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ ایک لمحہ کو اسے لگا جیسے دیر ہو گئی لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ پھر کلینک جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو قصداً انجان بن کر اور بہت سرسری انداز میں اماں جی سے پوچھنے لگی۔

"چلے گئے مہمان؟"

"ہاں۔" اماں جی نے ناراض لہجے میں مختصر سا جواب دیا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولی۔

"اماں جی! میں کیا کروں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ کم از کم آپ کو تو میری کیفیت

سمجھنی چاہیے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" مغرب سے میمونہ بھابھی نے کہا تو اس نے پہلے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

"اماں جی کو بھی سمجھائیں۔"

"ان کو میں سمجھا لوں گی، پہلے تم سمجھ لو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا۔"

"آئندہ۔" اس کی سوالیہ نظروں میں بے تابی تھی۔

"ہاں آئندہ۔ وہ پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔" میمونہ بھابھی نے کہا تو اس نے بمشکل خود کو "کب؟" کہنے سے روکا اور ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"اچھا! ابھی تو مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔ واپس آ کر آپ سے بات کروں گی تب تک آپ اماں جی کو سمجھا دیجیے کہ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔"

"ارے تم سے کون ناراض ہوتا ہے؟ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پتا نہیں کون سے جہاں میں رہتی ہو؟" میمونہ بھابھی کو اس سے یہی شکوہ تھا جس پر وہ ہمیشہ کی طرح ہنستی ہوئی باہر نکل آئی۔

گو کہ اس وقت اس کا کلینک آنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے چند مریضوں کو اسٹینڈ کر کے باقی کو ڈاکٹر صائمہ کے پاس بھیج دیا اور سسٹر کو دروازہ بند کر کے جانے کا کہہ کر ٹیلی فون سیٹ قریب کھینچ لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تیسری بیل کے بعد ان کی آواز آئی تھی۔

"یس! شاہ سکندر حیات!"

"السلام علیکم!" اس نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ مان اسے حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ہار کر بھی جیت گئی ہے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟" شاہ سکندر کو جیسے خوشگوار احساس ملا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو یہاں میرے کلینک آ جائیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے بغیر جھجک کے کہا۔

"ظاہر ہے، ضروری بات کرنی ہو گی لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کلینک ہی میں بیٹھ کر بات کریں۔" شاہ سکندر نے قدرے جتا کر کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔"

"تھینک یو۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں آپ کو وہاں سے پک کروں گا، اوکے۔"

"اوکے۔" اس نے ریسیور رکھ کر گھڑی دیکھی اور پھر یونہی بیٹھنے کے بجائے راؤنڈ پر نکل گئی۔ پندرہ منٹ میں وہ صرف جنرل وارڈ ہی کا راؤنڈ لگا سکی تھی۔ وہ بھی بڑی عجلت میں۔ پھر سسٹر سے کہہ کر وہیں سے باہر نکل آئی۔

شاہ سکندر گاڑی سے اتر رہے تھے۔ اسے دیکھا تو وہیں رک گئے اور دروازہ اس کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔

وہ جس اعتماد سے چل رہی تھی اسی اعتماد سے ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور پندرہ منٹ بعد ایک فائیو اسٹار میں دونوں آمنے سامنے تھے۔

"مجھے صباحت کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔" اس نے بیٹھتے ہی کہا تھا۔

"وہی اس کی شادی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آج آپ کے بھائی شاہ جہانگیر حیات اپنی بیگم کے ساتھ آئے تھے۔"

"آپ نے کیا کہا ان سے؟" آسیہ نے بات ختم نہیں کی تھی کہ وہ بول پڑے۔

"میری ان سے بات نہیں ہوئی۔ میں اصل میں پہلے خود کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ان سے بات کروں گی۔ شاید آپ کو یاد ہو ایک بار آپ نے کہا تھا کہ میں صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہوں اس سے مجھے صباحت کی بہتری نظر نہیں آتی۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کریں گے یا ان سب باتوں کو چھوڑ دیں۔ مجھے صرف آپ کی ضمانت چاہیے۔"

اس نے بات مختصر کرنے کی خاطر آخر میں ایک جملہ کہا تھا اور فوری طور پر خود اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ ان پر بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کر گئی ہے۔

"صرف میری!" شاہ سکندر گویا پھر سے زندہ ہو گئے تھے جو تھوڑی توجہ سگار نے کھینچ لی تھی، انہوں نے وہ بھی اس کی طرف مبذول کرنے کی خاطر سگار ایش ٹرے میں ڈال دیا پھر براہ راست اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

"یہ سچ ہے کہ میرے پیش نظر صباحت کی بہتری تھی اور ہے اس کی ضمانت مجھے علی جہانگیر پر اور اس کی محبت پر پورا بھروسا ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں۔ وہ کبھی اپنی محبت کے ساتھ فریب نہیں کرے گا اور میں اس بات کا بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شاہ پور کا کوئی شخص علی اور صبا کی زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا، نہ کوئی سازش ہو سکتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ صباحت میری بیٹی ہے اس لیے کہ وہ علی کی بیوی ہوگی۔ آپ اپنے دل سے تمام خدشات نکال دیں۔ آپ کی بیٹی انشاء اللہ بہت خوش رہے گی اور جب تک آپ نہیں چاہیں گی علی اسے شاہ پور نہیں لے جائے گا۔ یہ ساری باتیں میں خود علی سے طے کروں گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی کوئی شرط ہو تو وہ بھی کہہ دیں۔"

"نہیں، کوئی شرط نہیں۔" وہ جو ان کی باتوں کے دوران کچھ گم صم سی ہو گئی تھی اسی انداز میں بولی تھی۔

"پھر بھی آپ سوچ لیں اور جب تک آپ کا دل اس رشتے پر مکمل طور پر مطمئن نہ ہو جائے شادی کی ہاں نہ بھریں۔" شاہ سکندر ہر طرح سے اسے اہمیت دے رہے تھے۔

اسے لگا جیسے ساری دنیا کا اختیار اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اس انہونے اور انوکھے سے خیال سے اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

شاہ سکندر کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی لیکن وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکے۔

"چلیں!" کچھ دیر بعد وہ اپنے خیال سے نکل کر انہیں دیکھنے لگی۔

"نہیں، آئی مین کھانا" اس کے بعد کافی اور اس دوران ہم اچھے دوستوں کی طرح بہت ساری باتیں کریں گے۔

"بے مقصد!"

"ہاں، کبھی کبھی بے مقصد گفتگو بھی کر لینی چاہیے۔ ذہن فریش ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی گفتگو میں مسائل کا ذکر نہیں ہوتا۔" انہوں نے ویٹر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گویا فرار!"

"راحت۔۔۔" ان کے ہر انداز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ایسے ہم موسموں کی، رنگوں اور خوشبوؤں کی

باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ ابتدا آپ کریں گی یا میں۔"

"آپ۔۔۔" وہ بالکل غیر ارادی طور پر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

تمام راستہ آسیہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی تھی اور یہ سارا کمال اس بے مقصد گفتگو کا تھا۔

"واقعی، کبھی کبھی بے مقصد گفتگو کر لینی چاہیے۔" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچا اور پھر کچھ گن سی زینے کی طرف جا رہی تھی کہ میمونہ بھابھی نے پکار لیا۔

"آسیہ!"

"جی!" وہ چونک کر رکی اور برآمدے میں سب کو بیٹھے دیکھ کر اپنی بے دھیانی پر نادم سی ہو کر اس طرف آتی ہوئی بولی "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام کیا بہت تھک گئی ہو یا بھوک زیادہ لگ رہی ہے؟" میمونہ بھابھی نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔" اس کے جواب دینے سے پہلے ابا جی نے کہا تو وہ ان کے سامنے خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کھانا میں کھا چکی ہوں۔"

"کہاں ہاسپٹل میں؟"

وہ قصداً ان سنی کر کے بات بدل گئی۔

"لگتا ہے یہاں کوئی اہم مسئلہ زیر بحث تھا۔"

"ہاں، ہم صباحت کی شادی بات کر رہے تھے۔ تمہیں تو شاید احساس نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے پاس فرصت ہے کہ تم اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچ سکو۔" ابا جی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سخت سست کہنا شروع کیا تھا۔

"تمہیں صرف بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کا شوق تھا۔ ان کی تعلیم اور تربیت پر تم نے کوئی توجہ نہیں دی نہ تمہیں ان کا گھر بسانے سے دلچسپی ہے۔ آخر کیا سوچا ہے تم نے ان کے بارے میں اگر ان کی شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کم از کم اتنی تعلیم تو دلا دو کہ وہ تمہاری طرح۔۔۔"

"نہیں ابا جی! میری طرح نہیں۔" وہ جو سر جھکائے سن رہی تھی ایک دم بول پڑی۔ "وہ دونوں میری طرح ہو بھی نہیں سکتیں کیونکہ ان کے اندر شروع سے میرے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ پڑھائی میں دونوں بس نارمل ہیں۔ مزید کتنا بھی پڑھا لوں ڈاکٹرز بن سکتی ہیں نہ لیکچرار پھر بہتر یہی ہے کہ ان کی شادی ہو جائے۔"

"ہاں یہی میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔" ابا جی فوراً بول پڑے تھے۔ "میں نے شاہ جہانگیر کو جمعہ کے دن بلایا ہے۔ اس دن ہم شادی کی تاریخ رکھ دیں گے، تمہیں اگر اعتراض ہو تو ابھی بتا دو۔"

"نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کہا تو سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ غالباً کسی کو بھی اس کے اتنی جلدی مان جانے کی امید نہیں تھی۔

"لیجیے ابا جی! اسے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں؟" خلیل بھائی نے ابا جی کو مخاطب کیا تو وہ قدرے سٹپٹا گئے۔

"نہیں پریشانی تو کوئی نہیں۔"

"بس تو کوئی قریبی تاریخ طے کر لیجیے کیونکہ تیاری تو ہوگی، کیوں آپی؟" خلیل بھائی نے اس سے پوچھا۔

"جی تیاری تو ہے۔"

"اسی خوشی میں میں چائے لاتی ہوں۔" میمونہ بھائی اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرے لیے نہیں لائیے گا بھابھی! اور بچوں نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہوگا۔"

"تم نے تو کھا لیا ہے نا؟"

"جی میں تو کھا چکی ہوں۔"

"بس تو بیٹھو آرام سے۔ میں ثوبیہ سے کہلوا دیتی ہوں کہ وہ کھانا کھالیں۔" میمونہ بھابھی کہتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

کچھ دیر اس نے جس تیزی سے ثوبیہ کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا اس سے سمجھ گئی کہ میمونہ بھابھی نے کھانے کا کہلوانے کے ساتھ صباحت کو نئے موسموں کا سندیسہ بھی بھیج دیا ہے۔

❁ ❁ ❁

مدیحہ نیہل پر کھانا لگا کر دوبارہ آنگن میں نیہل اور صباحت کے پاس آ کر بیٹھی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سن کر نیہل کہنے لگے۔

"میرا خیال ہے پھوپھو آ رہی ہیں۔"

"تھینک گاڈ، چلیں اب آپ دونوں بھی انہیں مجھے بہت بھوک ——" ثوبیہ کو دیکھ کر مدیحہ نے بات وہیں چھوڑ کر برا سا منہ بنایا تھا۔

"آؤ ثوبیہ! کیا خبر لائی ہو؟" نیہل نے اس کے بھاگ کر آنے پر یونہی کہہ دیا تھا جس پر وہ حیران ہو کر بولی۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں کوئی خبر لائی ہوں؟"

"اس کا مطلب ہے واقعی کوئی خبر ہے۔" نیہل نے دادطلب نظروں سے صباحت کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھی۔ البتہ مدیحہ نے ان کی بات میں گلوا لگایا تھا۔

"وہ بھی اچھی۔"

"ہاں اچھی، بہت دنوں سے کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ جلدی بتاؤ ثوبیہ کیا بات ہے؟" نیہل نے مدیحہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ثوبیہ نے باری باری تینوں کو دیکھا پھر بڑے آرام سے بولی تھی۔

"وہ پھوپھو کہہ رہی ہیں۔ آپ تینوں کھانا کھالیں۔"

"اور ماما خود کہاں ہیں؟"

"نیچے سب کے ساتھ بیٹھی ہیں اور وہ کھانا کھا کر آئی ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ تم لوگ ان کا انتظار نہیں کرو۔" ثوبیہ نے مدیحہ کو جواب دے کر نیہل کو یوں دیکھا جیسے یہ تھی اچھی خبر۔

"یہاں آؤ۔" نیہل نے تحکم سے اسے اپنے پاس بلایا تو اس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔

"کیوں نیہل بھائی؟"

"میں کہہ رہا ہوں یہاں آؤ۔"

"میں سیمک سے بتا دیتی ہوں۔ پھوپھو صبا کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔"

ثوبیہ نے نیہل کے غصے سے ڈر کر جس تیزی سے کہا اسی طرح صباحت نے جھکا ہوا سر اونچا کیا تھا جبکہ نیہل اور مدیحہ خوشگوار حیرت میں گھر گئے تھے اور اسی انداز میں دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر صباحت کو دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ رکو صبا!" مدیحہ اپنی جگہ سے اچھل کر اس لپٹ گئی اور اس کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔ "مبارک ہو۔"

صباحت کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ اتر آئے تھے۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

"یہ بے ایمانی ہے نیہل بھائی! ان سے بھی تو پوچھیں کہ یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی ہیں؟" ثوبیہ نے نیہل کو ان دونوں کی طرف متوجہ کر کے احتجاج کیا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے صباحت خود کو چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

"ہاں کیا کہہ رہی ہو تم؟" مدیحہ نے ثوبیہ کی طرف گھوم کر پوچھا وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"ارے تم ناراض ہو گئیں۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں بہت اچھی چائے پلاؤں گی۔" مدیحہ نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

"تم چائے پلاؤ گی؟" ثوبیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں تو وہ چیخ پڑی۔

"کیوں کیا پہلے کبھی نہیں پلائی؟"

"ہائیں یہ تم دونوں کس خوشی میں لڑنے لگیں۔ چلو مدحا تمہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اسے بھی بلاؤ صبا کو۔" نیہل نے انہیں ٹوک کر کہا۔

"صبا کو میں بلاتی ہوں، آپ چلیں۔" مدیحہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔

صباحت الماری کے اندر سر گھسائے جانے کیا کر رہی تھی۔

"یہاں نہیں ملے گا۔" مدیحہ نے اس کے قریب آ کر زور سے کہا تو وہ اچھل پڑی۔

"کیا؟"

"علی۔"

"اف مدحا تم بہت بدتمیز ہو۔"

"وہ تو میں ہوں اور خالی پیٹ میں اور بھی بہت کچھ ہو جاتی ہوں۔" مدیحہ نے بڑے آرام سے اعتراف کے ساتھ بھوک کا احساس دلایا۔

"تو جاؤ، کھانا کھاؤ۔"

"کھانے ہی کے لیے بلانے آئی ہوں تمہیں، چلو۔"

مدیحہ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کی ایک نہیں سنی۔ کھنچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ پھر کھانے کے دوران نیہل یوں بنے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی اور انہوں نے مدیحہ اور ثوبیہ کو بھی اشارہ کر دیا تھا لیکن وہ کہاں باز آنے والی تھیں۔ مسلسل اسے چھیڑتی رہیں جس سے وہ کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی کہ آپی کو آتے دیکھ کر نیہل کے نیچے مدیحہ کو پیر مارتے ہوئے بولی۔

"مما آ رہی ہیں۔"

"مما! آپ نے بہت اچھا کیا۔" مدیحہ نے بے اختیار ہو کر نعرہ لگایا پھر ایکدم بیٹھ بھی گئی کیونکہ آسیہ تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"آیئے پھوپھو!"

"بس بیٹا! تم لوگ آرام سے کھاؤ میں ذرا چینج کرلوں۔" آسیہ ایک نظر صباحت پر ڈال کر وہیں سے واپس لوٹ گئی تو نبیل مدیحہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"تمہیں کیا ہوا تھا؟"

"چھوڑیں نبیل بھائی! مما بھی بس ایسی ہی ہیں انضمام الحق جیسی۔"

مدیحہ نے بڑا سا منہ بنا کر کہا تو وہ تینوں بے ساختہ ہنسنے کے ساتھ بولے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔"

"انضمام الحق چھکا لگائے یا بولڈ ہو جائے اس کی شکل پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔" مدیحہ خود اسی انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو ثوبیہ بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔

"جی نہیں، پھوپھو کا چہرہ سپاٹ نہیں ہے۔ پھر ان کی آنکھیں بھی بولتی ہیں۔ ہے نا نبیل بھائی۔"

نبیل نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا پھر مدیحہ کو جاتے دیکھ کر فوراً پکار کر بولے۔

"مدیحہ تم نے کھانے کے بعد چائے پلانے کا کہا تھا۔"

"میں لاتی ہوں چائے۔ ثوبیہ! تم جاؤ نہیں۔" صباحت کو وہاں سے اٹھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔

کچن میں آ کر اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھا پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھی تو اس کا دل چاہا اب کوئی اس کے پاس نہ آئے اور نہ اسے بلائے۔ اس کے گرد جو ایک خوب صورت سا حصار کھنچ گیا تھا وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتی تھی، لیکن چند لمحوں بعد ہی مدیحہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔ وہ پتا نہیں کس سے کیا کہہ رہی تھی اور شاید اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر ٹی پاٹ میں چائے دم کرنے لگی تب ہی مدیحہ کچن میں آ کر بولی۔

"ارے چائے تم بنا رہی ہو؟"

"اچھا سنو ابھی میں مما سے تمہاری شادی کا پوچھ کر آ رہی ہوں، ان کا ارادہ ایک مہینے میں تمہیں رخصت کر دینے کا ہے اور میں نے سوچا ہے اب جتنے دن تم یہاں ہو میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ البتہ شادی کے بعد جب تم علی کے ساتھ آؤ گی تب میں سارے کام تم سے کراؤں گی چاہے علی کو برا لگے یا بھلا۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے اسے برا لگے گا؟" مدیحہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اس کی شرارت سمجھ رہی تھی جب ہی کوئی جواب نہیں دیا اور ٹرے اٹھا کر اسے تھما دی۔

❁ ❁ ❁

شاہ جہانگیر جمعہ کے دن پھر عارفہ بیگم کو ساتھ لے کر آ گئے تھے۔ گو کہ گزشتہ بار آسیہ کا رویہ انتہائی مایوس کن تھا۔ لیکن اس کے بعد اباجی اور میمونہ بھابھی نے اپنے طور پر آسیہ کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں گے۔ لیکن اس کے مان جانے کا یقین نہیں دلایا تھا اس لیے شاہ جہانگیر کچھ زیادہ پرامید نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ابھی بھی ٹال دیے جائیں گے۔ البتہ گھر سے چلتے ہوئے علی کو تسلی

دے آئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اسے آسیہ کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا تھا صرف اس لیے کہ انہیں خدشہ تھا کہ علی دوبارہ انہیں آسیہ کے پاس نہیں جانے دے گا اور خود فیصلہ کر کے نہ صرف اس رشتے کو ختم کر دے گا، باقی سب سے بھی ناتا توڑ لے گا۔ وہ یقیناً ان دنوں ہر ایک سے اس قدر متنفر ہو رہا تھا کہ اس سے ہر قسم کے اقدام کی توقع کی جا سکتی تھی اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہی کھیل جاتا۔ اسی لیے شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم جہاں بوکھلائے ہوئے تھے وہاں اس کے سامنے محتاط بھی اتنے ہی تھے۔ جانتے تھے کہ وہ کتنا اصول پسند ہے۔ اس کے دل میں ہر رشتے کی اپنی جگہ اور مقام ہے۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دے سکتا۔ نہ صباحت کی خاطر ماں باپ کو چھوڑے گا اور نہ ماں باپ کی خاطر صباحت کو۔ اگر انتخاب کا مرحلہ آیا تو وہ خود کو درمیان سے ہٹا لے گا۔

اس میں اور شاہ سکندر میں یہی فرق تھا اور یہ شاہ سکندر بھی جان گئے تھے جب ہی اس کی ضمانت لیتے ہوئے انہوں نے آسیہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شاہ پور چھوڑ دے گا بلکہ صباحت کے جانے کا بھی مبہم سا اشارہ دیا تھا کہ جب آسیہ چاہے گی تب وہ بھی جائے گی۔

بہرحال شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم اس وقت کوئی اچھی امید لے کر نہیں آئے تھے البتہ اطمینان ضرور تھا کہ گھر کے دوسرے افراد ان سے اچھی طرح ملیں گے۔ حسب سابق اباجی ہی انہیں ڈرائنگ روم تک لائے تھے اور انہیں بٹھا کر اندر چلے گئے تھے۔

"سوری، آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی میں اصل میں ابھی آفس سے آیا تھا۔"

"پھر تو ہم نے آپ کو زحمت دی۔" شاہ جہانگیر نے کہا۔

"بالکل نہیں، پلیز تشریف رکھیں۔"

شاہ جہانگیر نے اباجی کو دیکھا اور ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھے تھے کہ دوبارہ کھڑے ہو گئے کیونکہ میمونہ بھابھی اماں جی کے ساتھ داخل ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے آسیہ تھی۔

پھر ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

شاہ جہانگیر کو اندازہ نہیں تھا کہ ادھر سب لوگ کیا سوچے بیٹھے ہیں اس لیے اپنا مدعا دہرانے کے لیے انہیں سوچنا پڑ رہا تھا جبکہ ادھر سب منتظر تھے کہ بات وہ شروع کریں۔

عارفہ بیگم کو پہلے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس طویل ہوتی خاموشی سے مزید گھبرا کر وہ بول پڑیں۔

"پھر کیا سوچا آپ نے؟"

شاہ جہانگیر نے چونک کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر ان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

"ہم اچھی امید لے کر آئے ہیں۔ آپ بڑے ظرف کے لوگ ہیں۔ یقیناً اچھا سوچا ہو گا جس میں بچوں کی بہتری ہو گی۔"

"ماں باپ تو بہتری سوچتے ہیں۔ دعا کریں آگے لکھنے والے نے بہتری لکھی ہو۔" نبیل بھائی نے کہا تو اباجی ان کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"لکھنے والا بہتر ہے بس ہم انسان اس کی مصلحتیں نہیں سمجھتے۔ ٹوٹے رشتے پھر سے استوار ہونے میں بھی یقیناً اس کی کوئی مصلحت ہو گی اور ہمیں چاہیے ہم گزشتہ ساری باتوں ساری رنجشوں اور کدورتوں کو مٹا کر ایک دوسرے کو معاف کر دیں ہمارے دل صاف ہوں گے تو آگے راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔" اباجی نے خاموش ہو کر باری باری سب کے جھکے ہوئے سروں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"بہر حال آپ اچھی امید لے کر آئے ہیں اور ہم اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے آپ کو مایوس نہیں کریں گے، شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سراسمہ سے ابا جی کو دیکھے جا رہے تھے۔

"کچھ چائے وغیرہ۔" خلیل بھائی نے ان دونوں کو اس کیفیت سے نکالنے کی خاطر قدرے اونچی آواز میں کہا تو واقعی وہ بری طرح چونکے، پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ابا جی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ممنون لہجے میں بولے تھے۔

"آپ نے تو ہمیں خرید لیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں آپ کا اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر سکوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ابا جی نے ان کا کندھا تھپک کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر عارفہ بیگم کو کھڑے دیکھ کر آسیہ کو اشارا کیا تو وہ اٹھ کر ان کے گلے لگتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔"

شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو ان کی توقع کے بالکل برعکس اور اچانک جو خوشی ملی تھی، وہ ان سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً علی کو اطلاع دے کر اس خوشی میں شریک کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبر کیا تھا۔ تاریخ رکھنے کے بعد چائے پینے تک رکیں پھر سب نے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں البتہ شاہ جہانگیر نے بہت تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ فرداً فرداً سب سے ملے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔

"کمال ہو گیا شاہ جی! اس روز تو ڈاکٹرنی۔" عارفہ بیگم شروع ہوئی تھیں کہ انہوں نے ٹوک دیا۔

"بس عارفہ بیگم! اس روز کیا ہوا کیا نہیں پچھلی ساری باتیں بھول جاؤ۔ بس آج کو یاد رکھو اور آج کے بعد آنے والا دن ایسا ہی خوشیوں بھرا ہونا چاہیے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" عارفہ بیگم فوراً بولی تھیں۔

اور جب وہ گھر پہنچے تو آگے علی ان کا انتظار تو کر رہا تھا، لیکن کھانے کے لیے جب ہی دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"بس امی جلدی سے آ جائیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" اس کے ساتھ ہی ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا تو شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر علی کے پیچھے ڈائننگ روم میں آتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کوئی خاص ڈش بنوائی ہے کیا؟"

"پتا نہیں ابا! کرم دین نے کیا بنایا ہے؟ آپ بیٹھیں۔"

"بھوک تو نہیں ہے پھر بھی تمہارے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ بیٹھو عارفہ!" شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کے لیے کرسی کھینچی پھر اپنے لیے کھینچ کر بیٹھے تو بظاہر سرسری انداز میں کہنے لگے۔

"کھانے کے لیے وہ لوگ بھی روک رہے تھے لیکن تمہاری ماں کو بہت جلدی تھی۔"

"کس بات کی؟" اس نے سالن کا ڈونگا ان کے سامنے کرتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

"تمہیں خوشخبری سنانے کی، ہم تمہاری شادی کی تاریخ طے کر آئے ہیں۔" عارفہ بیگم نے ابھی بھی بہت جلدی دکھائی تھی۔

اور علی جہانگیر کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان دونوں کی ہوئی تھی۔ سراسمہ باری باری دونوں کو دیکھے گیا۔

"تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! اگلے مہینے کی بارہ تاریخ طے ہوئی ہے۔" شاہ جہانگیر پوری تفصیل کے ساتھ آسکدہ کا پروگرام بھی بتانے لگے اور وہ بظاہر سب سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ وہ بزدل سی لڑکی جو اس کی ہر ہر بات کے جواب میں رونے لگتی تھی۔ یا پھر ایک بات کہتی۔

"میں کیا کروں۔ میں مما کو دکھ نہیں دے سکتی۔"

ادھر شاہ جہانگیر سارا پروگرام بتانے کے بعد پتا نہیں کیا پوچھ رہے تھے، اس نے سنا ہی نہیں تو جواب کیا دیتا۔ تب عارفہ بیگم اونچی آواز میں اسے پکار کر بولی تھی۔

"علی تم سے پوچھ رہے ہیں۔"

"جی!" وہ چونکنے کے ساتھ سٹپٹا بھی گیا۔ "جی ابا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں کہہ رہا ہوں ادھر کا مسئلہ تو حل ہو گیا، اب بابا جان سے کیا کہوں؟" شاہ جہانگیر نے اس بار زور دے کر اپنی بات دہرائی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ سمجھا نہیں۔

"مطلب یہ کہ میں بابا جان سے کہہ کر نہیں آیا تھا کہ یہاں میں تمہاری شادی کے معاملات طے کرنے آ رہا ہوں اور اس بات پر وہ ناراض ہوں گے کہ ان کے علم میں لائے بغیر اور ان سے مشورہ کیے بغیر میں نے شادی طے کر دی۔"

"ابا! آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا بابا جان یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر آسیہ بغیر کسی شرما کے صحت کی رخصتی پر آمادہ ہو جائیں اور اسے وہ اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہوں گے نا کہ ناراض۔"

اس نے زچ ہو کر کہا تو عارفہ بیگم نے اس کی تائید کی۔

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شاہ جہانگیر نے یوں سر جھٹکا جیسے ان دونوں سے بات کرنا فضول ہے۔ پھر علی کو جانے کا اشارہ کر کے اٹھ گئے تھے۔

❁ ❁ ❁

جس روز سے شاہ سکندر حویلی چھوڑ کر گئے تھے بابا جان اپنے سب کام بھول گئے تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ بھی ترک کر رکھا تھا۔ سارا وقت اپنے کمرے میں بند۔ بس یہی سوچتے کہ سکندر نے ڈاکٹرنی اور اس کی بیٹیوں کو ان پر ترجیح دے کر اچھا نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کا ذہن مسلسل ان کے خلاف سوچتا رہتا تھا۔ شاہ سکندر سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہار جیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے اور لاکھ وہ خود کو بھی یہی کہہ کر فریب دیتے لیکن ان کی کیفیت اس جواری کی سی تھی جو ہارنے کے بعد انتقام پر اتر آتا ہے اور ان کے اندر انتقام کی آگ تو شروع سے دہک رہی تھی، اب مزید شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ لیکن وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔

اس وقت بھی جب شاہ جہانگیر نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا تو دوسرے کے اشارے سے جواب دے کر بہت ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگے۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"کراچی گیا تھا بابا جان!" شاہ جہانگیر ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بولے۔

"علی کے پاس، کیسا ہے علی' آیا نہیں بہت دنوں سے؟"

"ملازم آدمی ہے بابا جان! چھٹی مل جاتی ہے تو آ جاتا ہے۔"

"ہوں۔" وہ ہوں کے انداز میں لمبی سانس باہر نکال کر خاموش ہو گئے۔

شاہ جہانگیر گو کہ خود کو بہت تیار کر کے آئے تھے، پھر بھی انہیں اپنی بات کہنے میں بہت وقت ہو رہی تھی۔ اصل میں انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بابا جان کا ردعمل کیا ہوگا اور یہی دیکھنے کے لیے وہ بہت سوچ کر بولے۔

"وہ بابا جان میں علی کی سسرال گیا تھا۔"

"علی کی سسرال؟" بابا جان نے یوں دیکھا جیسے ہم سے پوچھے بغیر۔

"جی وہ علی کی شادی طے کرنے۔" شاہ جہانگیر نظریں چرا کر بولے۔ جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

"ہو گئی طے؟" بابا جان نے طنز سے پوچھا۔

"جی' اگلے مہینے کی بارہ تاریخ۔" شاہ جہانگیر اسی قدر کہہ سکے۔

"ہوں۔" بابا جان کچھ سوچنے کے بعد پوچھنے لگے۔ "کیا شرائط رکھی ہیں اس ڈاکٹرنی نے؟"

"شرائط! نہیں بابا جان! انہوں نے کوئی شرط نہیں رکھی۔"

اس جواب سے بابا جان کو اپنی اہمیت کم ہونے کے احساس سے شدید دھچکا لگا تھا۔ کتنی دیر انہیں خود پر قابو پانے میں لگی پھر بھی طنز سے بولے تھے۔

"اس کا مطلب ہے بیٹی بہت بھاری ہو گئی ہے اس پر۔"

شاہ جہانگیر مصلحتاً خاموش رہے۔

"خیر مبارک ہو تمہیں۔ اپنی بی بی جان کو بتایا؟" بابا جان اب انہیں ٹالنا چاہتے تھے۔

"جی نہیں' میں سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔"

"تو اب جا کر بتاؤ انہیں تاکہ وہ تیاری کر لیں۔"

"آپ' آپ چلیں گے بابا جان؟" شاہ جہانگیر نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا تو وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے۔

"کہاں؟"

"کراچی' میرا مطلب ہے' شادی میں شریک ہوں گے نا؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟" بابا جان بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

"میں تو یہی چاہوں گا کہ علی کے سر پر سہرا آپ سجائیں۔" شاہ جہانگیر ہر طرح سے ان کا مان ان کی بڑائی رکھنا چاہ رہے تھے۔

"ہاہاہا!" بابا جان نے طویل قہقہہ لگایا پھر کہنے لگے۔

"ہم اپنی اولاد کی خواہش رد نہیں کرتے جہانگیر! یہ تم جانتے ہی ہو۔ سکندر نے شہر میں شادی کرنی چاہی تھی تو ہم نے خود تمہیں بھیج کر اس کی شادی کرا دی تھی۔ علی نے جو چاہا اس کے لیے ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ہم اس وقت تک چین سے نہیں رہے جب تک اس لڑکی کو علی کی منکوحہ نہیں بنا دیا' اور اب تم چاہتے ہو کہ علی

کے سر پر سہرا ہم سجائیں تو تمہاری یہ خواہش ہم علی کی دوسری شادی میں پوری کر دیں گے۔"

"جی ــــ!" شاہ جہانگیر حقیقتاً چکرا گئے تھے۔ دیواریں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں اور سماعتوں میں بابا جان کی آواز تھی کہ پگھلا ہوا سیسہ۔ کس قدر سفاکی سے بول رہے تھے۔

"اپنی اولاد کی خواہش ہم ضرور پوری کرتے ہیں جہانگیر! اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی پڑیں، ہم دریغ نہیں کرتے چھوٹے سے گھر کی کیا اہمیت ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔ محبت کا نشہ اتر جائے پھر علی بھی اس طرح ہمارے پاس آئے گا جیسے سکندر آیا تھا۔"

"نہیں' نہیں بابا جان نہیں۔" شاہ جہانگیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آپ گھر اجاڑ سکتے ہیں۔ بستیاں اجاڑ سکتے ہیں لیکن دل کی بستیاں اجاڑنے پر آپ قادر نہیں ہیں۔ سکندر کو دیکھ لیں اس کے دل میں آج بھی وہی عورت بستی ہے۔"

"ہاہاہا!" بابا جان پھر قہقہہ لگا کر بولے تھے۔ "اور علی کے دل میں اس کی بیٹی۔"

"ہاں اور اب آپ وہ کہانی دوبارہ نہیں دہرائیں گے۔ اس سے نقصان ہمارا ہی ہوگا بابا جان! آپ خدا کے لیے اپنے بچوں پر رحم کریں' ہم نے ہماری اولاد نے کوئی ایسے جرم نہیں کیے جن کی پاداش میں آپ ہم سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین رہے ہیں۔" شاہ جہانگیر ان کے عزائم سوچ کر پریشان ہو گئے تھے۔

"ہم چھین رہے ہیں۔ ہم یا تم لوگوں کو ان شہر والیوں نے پاگل کر دیا ہے جو ایک کے بعد ایک ہمارے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے ان ماں بیٹیوں میں جن کے لیے پہلے سکندر ہمیں چھوڑ گیا اب تم ہمیں نفع نقصان سمجھا رہے ہو۔"

بابا جان غصے سے بول رہے تھے' لیکن آخر میں آپ ہی آپ ان کے لہجے میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے بابا جان! کیونکہ آپ کے نزدیک جذبوں کی کبھی اہمیت نہیں رہی۔ محبت پر آپ کا ایمان نہیں تھا۔ ورنہ آسیہ کو طلاق دلوانے سے پہلے ایک بار تو ضرور سوچتے اور اس وقت نہیں تو اب سوچ لیں کہ اس عورت کے لیے کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی اس نے خود پر سارے دروازے بند کر دیے کیوں اس لیے کہ جو عورت ایک بار دل سے جس کو اپنا مان لے پھر ہمیشہ کے لیے اسی کی ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کا محبوب اسے مٹی میں رول دے، ٹھوکر مار کر کہیں چلا جائے یا بیوگی کی چادر اوڑھا کر۔ ان کے دل سے نہیں نکلتا اور ایسی عورت کے لیے چھوڑنے والے تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔ سکندر تو پھر ڈنکے کی مار گیا ہے۔ اپنی زندگی بڑے آرام سے گزار لی اور ابھی بھی وہ اس کی خاطر یہاں سب چھوڑ کر نہیں گیا۔ اپنی بیٹیوں کے لیے جنہیں آپ ان کا اصل مقام دینے کو تیار نہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ بھی ان کے بارے میں نہ سوچے' وہ اپنی بیٹی کے لیے گیا ہے بابا جان اور میں اپنے بیٹے کی محبت سے مجبور ہوں۔"

شاہ جہانگیر بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے تھے۔

"اب ہمیں اپنی مجبوریوں کی داستان مت سنائیں جہانگیر! جاؤ جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

بابا جان بہت دیر سے ضبط کر رہے تھے بالآخر چیخ پڑے اور انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ بھی کیا تو شاہ جہانگیر نے یوں ہونٹ بھینچے جیسے مزید پتھر سے سر ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں پھر کمرے سے نکل گئے تھے۔

"مجبور' ہونہہ۔ ہم تو کبھی مجبور نہیں ہوئے یہ ہماری اولاد ہے نا۔"

بابا جان نخوت سے سر جھٹک کر اپنے آپ بول رہے تھے کہ شاہ تیمور کے آنے پر ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے ابھی بھی غصہ جھلک رہا تھا۔ جس سے شاہ تیمور خائف سا ہو کر دروازے کے پاس ہی رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" بابا جان نے پوچھا تب وہ آگے آتے ہوئے بولا۔ "میں ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں بابا جان!"

"ضروری بات۔" بابا جان کی پیشانی سکڑ گئی۔

شاہ تیمور کو اگر معلوم ہوتا کہ اس کے آنے سے پہلے یہاں شاہ جہانگیر اور بابا جان کے درمیان کیا بات ہو رہی تھی تو وہ ہرگز اس وقت نہ آتا لیکن اسے کیونکہ معلوم نہیں تھا اس لیے سہولت سے کہہ گیا۔

"جی! میں مدیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ شادی آپ ہی کرا سکتے ہیں۔"

"مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" بابا جان پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے پھر ایک دم رک کر بولے تھے۔

"کیوں خاندان میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں، مدیحہ سے زیادہ خوب صورت، پڑھی لکھی اور جائیداد والی، وہ تمہیں نظر نہیں آتیں۔"

شاہ تیمور خاموش رہا لیکن اس کے ہر انداز سے بغاوت جھلک رہی تھی۔ بابا جان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر وجہ پڑ کر رازداری سے پوچھنے لگے۔

"کیوں کرنا چاہتے ہو مدیحہ سے شادی؟"

"اس نے میری توہین کی ہے بابا جان! میرا مذاق اڑایا ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے اور میں اسے بتاؤں گا کہ دھوکا کیا ہوتا ہے۔" شاہ تیمور کا سلگتا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کیسی آگ دہک رہی ہے۔

"ہوں!" بابا جان کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی تھی۔ پھر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

"یہ سبق تو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ وہ اتنی سی لڑکی ہم سب کو دھوکا دے گئی۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ ہم تمہارے باپ سے کہتے ہیں کہ وہ پہلی فرصت میں سکندر کے پاس جائے اور مدیحہ سے تمہاری شادی کی بات کرے۔"

"سکندر چچا نہیں مانیں گے۔" شاہ تیمور نے مایوسی سے کہا۔

"کیوں کیوں نہیں مانے گا، علی کی شادی ہے کہ نہیں؟ تمہاری بھی ہو جائے گی اور پھر تمہارے باپ کا تو وہ بہت لحاظ کرتا ہے۔ اس کی بات خود ٹالے گا، نہ ڈاکٹرنی کو ٹالنے دے گا سمجھے۔ تم فکر مت کرو۔"

❁ ❁ ❁

"آج اتوار تو نہیں ہے پھر نبیل بھائی گھر پر۔" وہ سوچتے ہوئے نبیل کے کمرے میں آئی اور انہیں بیڈ پر دیکھ کر عادت کے مطابق پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا نبیل بھائی! آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں، بس ذرا سر میں درد تھا، وہ بھی اب نہیں ہے۔" نبیل نے بوا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اسے اطمینان دلایا۔

"لیکن آپ کی تو آنکھیں بھی لال ہو رہی ہیں۔" وہ نبیل مطمئن ہونے والی تھی۔

"سو کر اٹھا ہوں اس لیے ہو رہی ہوں گی۔ اب تم زبردستی مجھے کوئی بیماری لگا دو۔" نبیل نے چڑ کر کہا۔

"بیماری لگے آپ کے دشمنوں کو۔ آپ کو تو میری عمر لگ جائے۔"

"صبا!" نبیل نے فوراً ٹوکا۔ "فضول باتیں مت کیا کرو۔"

"ڈانٹ کیوں رہے ہیں۔ ایک تو میں پہلے ہی بور ہو رہی ہوں۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"کیوں مدحو کہاں ہے؟"

"بازار گئی ہے میں بھی چلی جاتی تو اچھا تھا۔"

"ہاں ذرا سکون ہو جاتا۔" نبیل نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مزید چھیڑا تو وہ چیخ کر بولی۔

"فکر نہیں کریں، میں آج جا رہی ہوں پھر آپ سکون سے رہیے گا۔"

"کہاں؟ تم کہاں جا رہی ہو؟" نبیل نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔

"بابا کے پاس، ابھی ان کی گاڑی آئے گی اور اب بس میں وہیں رہوں گی۔ یہاں نہیں آؤں گی آپ کو سکون چاہیے نا اور ہاں مدحو بھی میرے ساتھ جائے گی۔"

وہ ناراض سی ہو کر بولتی چلی گئی اور جب خاموش ہوئی تب بھی نبیل کچھ نہیں بولے جانے کیا سوچنے لگے تھے۔

"نبیل بھائی!" اس نے پہلے پکارا پھر ان کے پاس آ بیٹھی اور آہستہ سے ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگی۔

"آپ کیا سوچنے لگے؟"

"ہاں!" نبیل نے چونک کر اسے دیکھا تو افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کچھ نہیں۔"

"اچھا تانیے میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"تم اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ خیر تمہارا جانا تو یوں طے ہو گیا ہے لیکن مدحو کو تو ابھی یہیں رہنا ہے۔ جب تک اس کی کہیں بات طے نہیں ہوتی۔"

نبیل نے بظاہر جیسے چلتے انداز میں کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"آپ چاہتے ہیں مدحو کی کہیں بات طے ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ ساری زندگی وہ یونہی تو نہیں بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔" نبیل نظریں چرا کر بولے تھے۔

"آپ چاہیں تو وہ اس گھر میں رہ سکتی ہے اور یونہی نہیں۔" اس نے زور دے کر کہا تو نبیل اس کا مطلب سمجھ کر خاموش ہو گئے۔

"مسئلہ یہ ہے کہ آپ چاہتے ہی نہیں ہیں۔" وہ ان کے خاموش رہنے پر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ "پتا نہیں کیا سوچ رکھا ہے آپ نے یا آپ کو کسی خاص وقت کا انتظار ہے، عجیب بات ہے نا۔"

"میرا خیال ہے تمہیں چلانا چاہیے۔ تمہاری فضول باتیں سننے سے بہتر ہے میں۔" وہ بولتے ہوئے دوسری طرف اٹھ گئے۔

"فضول باتیں! آپ مدحو سے محبت کرتے ہیں یہ فضول بات ہے۔"

"بس خاموش ہو جاؤ صبا!" انہیں جانے کیوں غصہ آ گیا تھا۔

"آپ واقعی بزدل ہیں نبیل بھائی اور آپ کو محبت پر بھروسا بھی نہیں ہے، ورنہ مدحو کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہے جس کے سامنے اعتراف نہ کیا جا سکے۔ میں بتاؤں گی اسے کہ آپ۔"

"ہاں بتا دینا اور اس کے بعد بھول جانا کہ یہاں کوئی نبیل بھی تھا۔" انہوں نے اسی غصے سے کہا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا، وارڈ روب سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلے گئے۔ تو وہ پہلے جھنجھلائی پھر دل ہی دل میں افسوس کرتی ہوئی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی اور آگے مدحیہ کو کھڑے دیکھ کر تعجب سے بولی۔

"ہائیں۔ تم لوگ اتنی جلدی آ گئے۔"

مدحیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ چند قدم آگے آ کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے مدحو؟"

"وہ میں یہ بیگ دیکھ رہی تھی۔ کہیں جا رہی ہو کیا؟" مدحیہ نے ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور بیگ کے اندر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔

"صرف میں نہیں ہم دونوں جا رہے ہیں، پاپا کے پاس۔ وہ چاہتے ہیں میں کچھ دن ان کے ساتھ رہوں۔"

"ہاں پھر تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔" مدحیہ نے یہ بات کچھ کھوئے ہوئے انداز میں کہی تھی۔

"اچھا دیکھو، میں نے تمہارے یہ سوٹ رکھے ہیں۔" اس نے بیگ اپنی طرف کھینچ کر مدحیہ کے سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیے تو وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

"میرے کیوں، میں تو نہیں جا رہی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب۔ یہاں اتنے کام ہیں وہ کون کرے گا پھر مما بھی اکیلی ہو جائیں گی۔ تم بس جلدی آ جانا۔" مدحیہ قدرے ترشی سے کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

"ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاتی۔"

"ہٹ مت، پاپا نے بلایا ہے تمہیں ضرور جانا چاہئے۔ [illegible] میں ابھی مما کو راضی کر رہی ہوں۔ پھر ان کی ذات میں کمی ہوتی جاؤ گی۔" مدحیہ نا جانے کیوں ناراض ہو رہی تھی۔

"صبا، افتخار صاحب کی گاڑی آ گئی ہے۔"

"آ رہی ہوں بس جا رہی ہوں۔" اس نے بیگ بند کر کے مدحیہ کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

"یہ دو دن بعد آ جانا۔"

"یاد ہے انشاء اللہ میں آ جاؤں گی۔ خدا حافظ۔" وہ بیگ اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

سے مدحیہ سمجھ گئی کہ اس سے خفا ہو کر گئی ہے اور اسے معلوم کون سا مشکل تھا جو وہ اس کے پیچھے بھاگتی بس گہری سانس کھینچ کر رہ گئی پھر عمر کو کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے، کچھ چاہیے؟"

"ہاں تمہارے در سے میں ہمیشہ کچھ لینے ہی تو آتا ہوں۔" عمر نے کہا تو وہ اکتا کر بولی۔

"میں اس وقت تم سے کوئی بحث نہیں کروں گی۔"

"بحث کون کر رہا ہے۔ یہ بتاؤ، صبا ناراض ہو کر کیوں گئی؟"

"میں اس کے ساتھ نہیں گئی، اس نے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ میں کیوں نہیں گئی۔"

"تو پھر کرو مجھے کیا بتانے کو کہنے کو آیا ہوں میں تم سے کچھ پوچھوں گا۔" عمر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا وہیں سے واپس پلٹا تو اس نے ایک دم پکار لیا۔

"سنو عمر!"

عمر رک گیا لیکن اس کی طرف رخ نہیں موڑا تھا۔

"وہ مما اکیلی ہو جاتیں نا میں اس لئے نہیں گئی۔" اس نے کہا تو عمر جھٹکے سے اس کی طرف پلٹا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"یہ تمہیں دوسروں کا احساس کب سے ہونے لگا؟ تمہاری بلا سے کوئی اکیلا ہو یا۔" عمر اس کے گھورنے پر بات ادھوری چھوڑ کر ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

"ایک میری ہی ہر بات پر گرفت کیوں ہوتی ہے؟" وہ سوچتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر اسے بند کر کے اس کے ساتھ کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی اور یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں شاید کوئی نیا احساس ملا تھا۔ کچھ کھونے کا کچھ پانے کا لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"یہ صبا کیا کہہ رہی تھی نبیل بھائی سے؟"

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا اور سست روی سے آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے اندر دل جیسے کسی شکنجے میں آ گیا تھا اور ذہن کے پردوں پر کہیں دھندلے عکس لہرا رہے تھے، کہیں بہت واضح اور ہر جگہ ایک چہرہ بہت نمایاں تھا جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا اور آپ ہی آپ اس سے دشمنی بھی باندھ لی تھی کہ وہ کیوں اس کی ماں کی محبت میں حصہ دار بن کر آ گیا تھا۔

جب وہ چھوٹی تھی تب بھی آسیہ کی نبیل پر ذرا سی توجہ پر چیخ چلا کر احتجاج کرتی تھی اور اس پر بس نہیں تھا اس کے بعد نبیل سے بھی لڑتی تھی لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ الٹا اس کی طرف داری کرتے تھے اور اب تک ایسا ہی تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اسی عادت کو صباحت نے محبت سمجھ لیا تھا یا واقعی وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ کتنی دیر تک وہ اس بات پر الجھتی الجھن کی نتیجے پر نہیں پہنچی تو اس نے یہی سمجھ لیا کہ اس بات کو ذہن سے جھٹک دے۔ شاید یہ نبیل کے جذبے تھے جو اپنا مفاد رکھتے تھے۔

"صبا! ہاں صبا سے پوچھتی ہوں۔" اسے ایک دم صباحت کا خیال آیا تو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اسے فون کرنے کے ارادے سے لاؤنج میں آئی تو اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی تھی۔

"ہیلو صبا!" وہ کیونکہ صباحت سے ہی بات کرنے کا سوچ رہی تھی اس لئے ریسیور اٹھاتے ہی اسے

پکارا تھا۔

"میں صبا نہیں احمر ہوں۔" دوسری طرف سے احمر کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل گئی۔

"جی کیسے ہو آپ؟"

"تم کیسی ہو؟" احمر نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی گول کر گئی۔

"صبا اور نبیل بھائی دونوں نہیں ہیں اس وقت اور مما بھی تھکن کی ہوئی ہیں۔"

"اور مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" احمر نے فوراً کہا۔

"جی!" اس نے سننے کا اشارہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

"مجھے ابھی ثوبیہ کے خط سے صبا کی شادی کا پتا چلا ہے میں نے سوچا مبارکباد دے دوں۔"

"شادی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ کو ہے۔ بہرحال پیشگی مبارک باد کا پیشگی شکریہ اور کوئی بات؟"

"ہاں ایک بات اور ہے تم برا تو نہیں مانو گی؟" احمر نے رک کر پوچھا تھا۔

"میرے برا ماننے نہ ماننے کی چھوڑیں۔ آپ اپنی بات کہیں۔" وہ خاصی بے مروتی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"میں تمہیں اس شخص کا بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے ساتھ سب سے زیادہ مخلص ہے بہت محبت کرتا ہے وہ تم سے۔"

"کون؟" اس کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔

"نبیل بھائی!" احمر بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔

اسے لگا وہ اس سچائی کو کبھی نہیں جھٹلا سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک خیال آیا تھا۔ فوراً احمر کو پکار کر پوچھنے لگی۔

"احمر! آپ کو کس نے بتایا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے نبیل بھائی نے بتایا ہوگا۔ نہیں وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔" احمر نے کہا تو وہ اندر ہی اندر الجھ کر بولی۔

"پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"اس بات کو چھوڑو نادان لڑکی اور اصل بات سوچو۔ دنیا میں بے غرض و بے لوث محبت نایاب ہے، تم خوش قسمت ہو کہ۔"

شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دو تین بار کریڈل پر ہاتھ مارا پھر ریسیور رکھ کر پلٹی تو سامنے سے نبیل کو آتے دیکھ کر وہ ان ہی کے انتظار میں وہیں رک گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور جب نبیل قریب آئے تو وہ کچھ سٹپٹا کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

"کیا بات ہے؟" نبیل نے رک کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

"کچھ نہیں"

"پھر یہاں کیوں کھڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کسی کے فون کا انتظار ہے؟" نبیل کا انداز ہمیشہ کی طرح سادہ تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر اس کے لئے حب سے الگ جذبے چھپائے کھڑے ہیں۔

"وہ میں صبا کو فون کر رہی تھی لیکن نمبر ہی نہیں مل رہا۔" اس نے بات بنائی۔

"صبا کو! اچھا ہاں، شام میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پاپا کے ہاں جا رہی ہے۔ تم نہیں گئیں؟" نبیل نے ایک دم یاد آنے پر پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس دل نہیں چاہا۔"

"دل نہیں چاہا۔" نبیل ذرا سا مسکرائے پھر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے، تم نمبر ٹرائی کرو۔"

اس نے خاموشی سے انہیں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا پھر ٹیرس پر نکل آئی اور بہت چاہا کہ صباحت اور پھر احمر کی باتوں کو ذہن سے جھٹک دے، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنا اپنا دھیان ادھر ادھر کرتی کوئی نہ کوئی بات یاد آ جاتی۔

"نبیل بھائی کیا چاہتے ہیں۔ کاش تم جان سکو!" ایک بار صباحت نے کہا تھا۔

"وہ بہت گہرے ہیں کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔ پتا نہیں احمر پر کیسے ظاہر ہو گئے تھے جو وہ کہہ رہا تھا۔" "نادان لڑکی! اصل بات سوچو، دنیا میں بے غرض و بے لوث محبت نایاب ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ۔"

بے غرض و بے لوث محبت۔ ناممکن۔ وہ جھٹلانے کی سعی کرنے لگی۔ کائنات کا سارا نظام دو اور لو کے اصول پر چل رہا ہے۔ سودے بازی ہر جگہ سودے بازی۔

نقد یا ادھار۔

سب سودا سوچتے ہیں۔

زندگی کے کاروبار میں گھاٹے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔

محبت بھی کاروبار ہے۔ سراسر دکانداری۔

دل کے عوض دل۔

وہ یوں ہی اوٹ پٹانگ سوچے جا رہی تھی کہ آسیہ کی آواز سے چونک گئی۔

آسیہ نبیل کو پکار رہی تھی۔ وہ سامنے گئی تو کچھ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"تم گئیں نہیں بیٹا۔" پھر خود ہی کہنے لگی۔ "اچھا کیا یہاں اتنے کام ہیں۔"

"جی مما! میں اسی لئے نہیں گئی اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ صبا چلی جائے گی تو کیسا لگے گا۔" اس نے خوبصورتی سے بات بنائی۔ تب ہی نبیل کمرے سے نکل کر آئے تو آسیہ جو اس سے کچھ کہنے جا رہی تھی، نبیل کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"چلو بیٹا! بوا نے کھانا لگا دیا ہے۔ آؤ مدحو۔"

"جی مما چلیں۔" اس نے آسیہ کے بعد نبیل کو اندر جانے دیا پھر ان کے پیچھے ڈائننگ میں داخل ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صباحت کے ساتھ مہر النساء اور الماس کا رویہ خاصا سرد تھا اور ناگواری لئے ہوئے تھا۔ بس شاہ سکندر کے سامنے الماس نے اس سے دو چار جملے بولے تھے جبکہ مہر النساء نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور وہ مدیحہ نہیں تھی جو جواباً اپنے ہر عمل سے ان پر یہ جتاتی کہ اسے بھی ان کی پروا نہیں ہے۔ اسے پروا تھی جب ہی تو اسے نہ صرف بری طرح محسوس ہو رہا تھا بلکہ بہت دکھ بھی ہو رہا تھا اور رات جب تک اسے نیند نہیں آئی، وہ کڑھتی رہی تھی۔

صبح معمول سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی جگہ کی وجہ سے۔ بہرحال اس نے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی اور اٹھ کر نماز پڑھ لی۔ اس کے بعد کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کراچی کے موسم کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ دسمبر شروع ہو چکا، لیکن سردی بس برائے نام ہی تھی۔ صبح کے وقت کچھ ٹھنڈک محسوس ہوتی یا پھر شام میں۔

اس وقت فضا میں قدرے خنکی تھی جو کہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اترتے اجالے میں دھندلے منظر واضح ہونے لگے تھے۔ اس نے کھڑکی میں آگے کی طرف جھک کر بائیں سمت دیکھا تو لان کا کچھ حصہ نظر آیا۔ اتنے سے حصے میں ہی خوش رنگ پھولوں کی بہتات تھی اور وہ پھولوں کی دیوانی وہیں سے کود کر لان میں آئی تو حقیقتاً اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس نے کتنے چکر لگا ڈالے اور ابھی اس کا یہ شغل جاری تھا کہ شاہ سکندر آ گئے۔

"اسلام علیکم پاپا۔" وہ انہیں دیکھتے ہی تیز قدموں سے ان کے قریب چلی آئی تھی۔

"وعلیکم سلام آج کی صبح ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔" شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" اس نے کہا تو شاہ سکندر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر اس کے ساتھ لان چیئر پر آ بیٹھے اور کچھ دیر ایسی ہی ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد کہنے لگے۔

"بیٹا مجھے افسوس ہے کہ الماس اور اس کی ممی نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا بی ہیو نہیں کیا۔ آپ نے ضرور مائنڈ کیا ہوگا۔"

"نہیں پاپا۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن ان سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں کوشش کروں گی کہ انہیں بھی مجھ سے شکایت نہ ہو۔"

"گڈ یو آر آ لولی ڈاٹر۔" شاہ سکندر کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔

"تھینک یو۔"

"اور بیٹا! آپ کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا؟"

"ہوں۔ موڈی لڑکی ہے۔" انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ غالباً ان کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ پھر پکار کر پوچھنے لگی۔

"پاپا! آپ کے لئے چائے لاؤں؟"

"چائے۔" انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ابھی تک چائے نہیں آئی۔"

"میں لاتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھ کر اندر آئی تو آگے خانساماں چائے لئے کچن سے نکل رہا تھا۔ اس نے

ٹرے میں ایک کپ دیکھا تو وہیں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کیونکہ اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔

پھر ناشتے کے بعد شاہ سکندر چلے گئے تو وہ کتنی دیر اجنبیوں کی طرح لاؤنج میں بیٹھی رہ گئی۔ حالانکہ دو تین بار الماس وہاں سے گزری تھی لیکن مروتاً بھی اس سے بات نہیں کی اور مہر النساء تو اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلی تھی۔ اس لئے الماس سے بڑی ہونے کے باوجود اس نے پہل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور خود اس کے کمرے میں چلی آئی۔

الماس ایک کونے میں بچھے کارپٹ پر بیٹھی اپنے سامنے اخبار پھیلائے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے اطراف کچھ سادہ پیپرز بکھرے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے فوراً سر اونچا کیا اور اسے دیکھ کر اسی تیزی سے ادھر ادھر بکھرے پیپرز سمیٹنے میں لگ گئی۔ تو وہ اس کی اس حرکت کو قصداً نظر انداز کرتی ہوئی دوستانہ انداز میں بولی۔

"کیا ہو رہا ہے۔" الماس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔

"میں بہت بور ہو رہی ہوں۔ حالانکہ میرے شوق اور دلچسپی کے لئے بہت کچھ ہے لیکن پتا نہیں کیوں۔ نہ میرا پاپا کی لائبریری میں دل لگا نہ۔"

وہ اپنے آپ بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی تو الماس بلا ارادہ سے دیکھنے لگی اور اس کا مقصد اسی طرح اسے متوجہ کرنا تھا۔

"تم کوئی کام کر رہی تھیں۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ تم آرام سے اپنا کام کرو۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر نیچے ہی بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

"تمہارے کمرے کی سیٹنگ بہت خوبصورت ہے۔ اگر تم نے خود کی ہے تو یقیناً تم آرٹسٹک مائنڈ ہو۔ تمہارے سبجیکٹ کیا ہیں؟"

الماس خاموشی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بالکل مدیحہ جیسی لگ رہی تھی۔ لیکن اس کا ہر انداز اس سے مختلف تھا۔ نہ لہجے میں تفاخر، نہ آنکھوں میں خشونت، اس کے برعکس اپنائیت کا احساس دیتی لگ رہی تھی۔

"فائن آرٹس۔" اس نے جواب نہ پا کر خود ہی قیاس کر کے کہا تو اس بار الماس بے اختیار بول گئی۔

"نہیں سائنس"

"ارے تم سائنس کی اسٹوڈنٹ ہو۔ کون سی کلاس میں ہو۔" اس نے حیرت کے اظہار کے ساتھ دلچسپی بھی ظاہر کی۔

"انٹر کا امتحان دیا ہے۔"

"ویری گڈ۔ آگے کیا ارادہ ہے؟"

"پاپا کا ارادہ میڈیکل میں میرا ایڈمیشن کرانے کا ہے۔" الماس قدرے جھجک کر جواب دے رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کی ذات میں اس طرح دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اس نے فوراً کہا پھر اس کی بات پر غور کر کے پوچھنے لگی۔ "کیا کہا تم نے پاپا کا ارادہ تو کیا تمہیں شوق نہیں ہے ڈاکٹر بننے کا۔"

"مجھے بھی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی۔" الماس نے کہا۔

"کیوں؟" وہ پوچھ کر خود ہی جز بز سی ہو گئی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی امی کیوں نہیں چاہتیں۔

"آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟" الماس خوبصورتی سے بدل گئی۔

"میں فرسٹ ایئر کے پیپر دے چکی تھی، اس کے بعد کالج چھوڑ دیا۔"

"کیوں؟" الماس نے بھی اس کی طرح فوراً پوچھا لیکن پھر خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔

"اچھا ہاں پھر آپ کی شادی ہو گئی تھی۔"

"شادی۔" وہ ہنسی تو الماس قدرے جھینپ کر بولی۔

"شادی ہی تھی۔"

"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ۔" وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ مہر النساء کی آواز خاموش ہو گئی۔

مہر النساء نے الماس کو پکارنے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لیکن جب اسے دیکھا تو اندر نہیں آئی اور وہیں دروازے ہی میں رک کر بولی تھی۔

"الماس، میں عمیر کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔"

"میں چلوں۔" الماس نے چند لمحے رک کر سوچا پھر کہنے لگی۔ "میں نہیں جا رہی۔ صباحی اکیلی ہو جائیں گی۔"

مہر النساء کو اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی جبکہ وہ بے انتہا خوش لیکن بہت سنبھل کر بولی۔

"ارے نہیں۔ میری وجہ سے تم اپنا جانا ملتوی نہیں کرو۔"

"نہیں۔ بس میں نہیں جا رہی۔" الماس نے اس سے کہتے ہوئے مہر النساء کو دیکھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم لوگ کھانا کھا لینا۔"

پھر دو دن میں الماس اس کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی اور مہر النساء گو کہ خود سے اس سے بات نہیں کر رہی تھی، لیکن اس کی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ اس کے انداز میں وہ تنفر اور ناگواری بھی نہیں رہی تھی اور اس کے لئے فی الحال یہی بہت تھا۔ یوں بھی ابھی وہ بہت زیادہ دنوں کے لئے نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا مزید دو دن رک کر وہ چلی جائے گی۔ اس وقت الماس کے ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے وہ اس سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کل یا پرسوں وہ چلی جائے گی۔

"کیوں، میرا مطلب ہے، اتنی جلدی کیوں جائیں گی۔ ابھی تو آپ کی شادی میں بہت دن ہیں؟"
الماس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو وہ رک کر بولی۔

"وہ تو ہیں لیکن مجھے مدو کا خیال آ رہا ہے۔ جب میں آ رہی تھی تو وہ کچھ خفا سی لگ رہی تھی اور دیکھو اس نے فون بھی نہیں کیا۔"

"آپ فون کریں۔ میں امی کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔" الماس اسے لان میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

وہ نمبر ڈائل کر کے انتظار کرنے لگی۔ مما اور جمیل بھائی کا تو اسے پتہ تھا کہ اس وقت دونوں گھر پر نہیں ہوں گے اور مدیحہ نے کتنی دیر بعد ریسیور اٹھایا تھا۔

"کیا کر رہی تھیں؟" اس نے چھوٹتے ہی ٹوکا۔

"ریسرچ۔" ادھر مدیحہ کس موڈ میں تھی وہ سمجھ نہیں سکی۔

"کاہے پر؟"

"میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ بلکہ میں اب کوئی بات تمہیں نہیں بتاؤں گی۔" مدیحہ نے زور دے کر کہا۔

"کیوں مجھے کیوں نہیں بتاؤ گی۔" اس نے حیران ہو کر ٹوکا۔

"اس لئے کہ تم ہر بات مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔"

"کیا میں نے کیا بات چھپائی ہے؟"

"اپنے آپ سے پوچھو۔"

"میں بالکل نہیں جان پاؤں گی۔ تم بتا دو پلیز۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"کہو مت۔ یہ بتاؤ واپس کب آ رہی ہو۔"

"اگلے ہفتے۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

"اگلے ہفتے کیوں، اگلے مہینے آنا۔" مدیحہ پر اس کی لجاجت کا اثر ہوا تھا نہ روٹھنے کا، فوراً فون بند کر دیا۔

❁.....❁.....❁

علی جہانگیر کو اس وقت صباحت کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے ادھر سے کسی اور کے ریسیور اٹھانے کا خدشہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی آواز سننے کو ملے۔ لیکن دوسری طرف مدیحہ تھی جس کی آواز سنتے ہی وہ بے ساختہ ہنس کر بولا۔

"تمہیں کیا پہرے پر بٹھایا ہوا ہے؟"

"جناب! آپ کو کوئی اعتراض ہے۔" وہ ہنسی کے درمیان بولی تھی۔

"اعتراض ہو بھی تو تم کون سا ماننے والی ہو۔ چلو بلاؤ اسے۔" اس نے رعب سے حق جتایا تو ادھر سے کورا جواب آیا۔

"وہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب وہ یہاں نہیں ہے۔ پاپا کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ مدیحہ روانی سے بتا کر پوچھنے لگی" اور بتائیں کس کو بلاؤں؟"

"کسی کو نہیں۔ بس سب کو سلام کہہ دینا۔" وہ عجلت میں فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور وہیں سے عارفہ بیگم کو پکار کر بولا تھا۔

"امی! میں چچا جان کی طرف جا رہا ہوں۔"

اور پھر آدھے گھنٹے کا فاصلہ اس نے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا۔ طویل راہداری سے گزر کر جب وہ گول کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ہی وہ الماس کے ساتھ بیٹھی نظر آئی، جس پر اسے حیرت ہوئی کیونکہ مدیحہ کو اس نے شاہ پور میں کسی کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے اپنی حیرت چھپا کر قدرے اونچی آواز میں سلام کیا تو جہاں وہ چونک کر بلا ارادہ کھڑی ہو گئی وہاں الماس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ارے۔ علی بھائی آپ۔"

''ہاں مجھے ابھی پتا چلا کہ جسے میں سارے شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں وہ تمہارے پاس ہے۔'' وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''جی نہیں۔ ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔'' الماس فوراً صباحت کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا دیئے۔

''پھر کب مل سکتا ہوں۔ ان سے پوچھ کر بتاؤ۔'' اس نے شرارت سے اسے دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا تو وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

''مل گیا جواب، وہ ملنا ہی نہیں چاہتیں۔'' الماس نے کہا تو وہ مایوس سی شکل بنا کر بولا۔

''اب کیا کروں؟''

''صبر۔'' الماس ہنسی۔

''شٹ اپ، یہ بتاؤ چچا جان اور چچی جان کہاں ہیں؟''

''وہ کسی تقریب میں گئے ہیں۔''

''اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ چائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو، میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔'' وہ اسے سامنے سے ہٹاتا ہوا اسی کمرے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے الماس نے اسے روکنے کی کوشش میں یہاں تک کہا کہ دیکھیں پاپا آ رہے ہیں۔ لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر ہی رکا تھا۔

وہ کھڑکی کا پردہ تھامے اس میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی، گھبراہٹ میں کبھی پردہ ادھر کھینچتی کبھی ادھر۔

''لاؤ میں تمہاری مدد کروں۔'' وہ اس کے قریب جا کر بولا اور پردے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا تو وہ بمشکل اپنا توازن قائم رکھ کر بولی۔

''آپ کیوں آئے ہیں؟''

''یہ دیکھنے کہ اپنے دل کی بستی میں تم نے میرے نام کے جو گل کھلائے تھے، ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔'' وہ پرشوق نظروں سے اس کے چہرے پر اترتے رنگ دیکھ رہا تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔

علی جہانگیر نے ایک بار اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا پھر ہونٹوں سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے یقین کر لینے دو صبا کہ ہم ساری آزمائشوں سے گزر کر اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ سنو، تمہارے دل میں اگر کوئی خدشہ باقی رہ گیا ہو تو اسے بھی نکال پھینکو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہمارے راستے میں اب صرف پھول ہی پھول کھلیں گے کوئی کانٹا نہیں ہوگا۔ بہت کانٹے ہوں گے۔ جتنے پھول ان سے زیادہ کانٹے۔ لیکن میں تمہیں ان سے نہیں الجھنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

وہ اس کے دلنشیں لہجے میں کھو کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''اور ہاں۔ مجھے تمہاری ثابت قدمی نے بہت امپریس کیا ہے۔ اول روز تم نے جو بات کی، آخر تک اس پر قائم رہیں کہ تمہاری مما جو فیصلہ کریں گی۔ تمہیں وہی قبول کرنا ہے اور اب جبکہ ہمارے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے تو کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت میں بھی ایسی ہی شدت پسندی کا مظاہرہ کرو گی۔'' وہ اپنی نظریں اس کی پوری کھلی آنکھوں میں اتار کر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

صباحت نے پلکیں جھکا کر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تھی۔

''اگر کبھی آپ کو میری آزمائش مطلوب ہو تو جان مانگیے گا۔''

''اوں ہوں۔'' اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے بہت نرمی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔

''مانگوں گا نہیں، جان دوں گا۔''

وہ اس کی مزید کسی جسارت سے بچنے کی خاطر دو قدم اور پیچھے ہٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''الماس آ رہی ہے شاید۔''

''اتنی بیوقوف نہیں ہے وہ۔'' وہ مسکراتا ہوا پھر اس کے قریب آنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک کے ساتھ الماس پکار کر بولی۔

''علی بھائی! پاپا آ گئے ہیں۔''

''اف یہ تو واقعی بے وقوف ہے۔'' وہ گہری سانس کے ساتھ بڑبڑایا تو وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ پردہ کھینچ کر پھر اس کی اوٹ میں ہو گئی۔

''او کے، جلدی ملیں گے۔'' وہ اس کے پردے کو مٹھی سے تھامے ہاتھ کو ہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا اور الماس کے اشارے پر جلدی سے اس جگہ آ بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شاہ سکندر اور مہر النساء اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''السلام علیکم۔'' اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا تو شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔

''او علی! کیسے ہو۔ بڑے دنوں بعد آئے؟''

''بس چچا جان! سوچتا تو روز تھا آنے کا لیکن۔'' وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''ابا کہاں ہیں تمہارے؟'' شاہ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ پور۔ امی البتہ یہیں ہیں۔''

''انہیں بھی لے آتے۔'' مہر النساء نے کہا۔

''لے آؤں گا چچی جان! ابھی میں گھر سے نہیں آ رہا۔'' اس نے مبالغے سے کام لیا۔

''اور کھانا وغیرہ کھایا؟''

''نہیں۔ چائے کا کہا تھا الماس سے۔'' اس نے الماس کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔

''چائے آپ کو ضرور ملے گی لیکن کھانے کے بعد۔''

❁ ❁ ❁

شادی کی تیاریوں میں دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے اور اس بار مدیحہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اسلام آباد سے سیما بھابی، سمیعہ اور سونیا بھی آ گئی تھی۔ سمیعہ کی گود میں چند ماہ کا بیٹا تھا اور سب کی زیادہ توجہ اس بچے نے کھینچ لی تھی۔ سمیعہ سارا وقت اسے ڈھونڈتی پھرتی۔

''ابھی عمر کے پاس تھا۔''

"مدحو سے پوچھو، وہ اس کے کپڑے بدل رہی تھی۔" سارا دن ایسی آوازیں گونجتی رہتیں اور رات میں ڈھولک کے ساتھ فلمی مذاق میں محفل کتنے رنگ بدلتی تھی۔ کبھی سب سنجیدہ ہو جاتے کبھی بہت شوخ، ایسے میں جب مدیحہ چائے لے کر آتی تو وہ ہر روز نئے سرے سے باقاعدہ حیرت کا اظہار کرتے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ برا نہیں مان رہی تھی اور پلٹ کر جواب دینا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔

اس وقت وہ چائے لے کر آئی تو سب سے پہلے عمر شروع ہوا تھا۔

"واؤ، مدحو چائے لے کر آئی۔ آج ضرور سورج مشرق سے طلوع ہوا ہوگا۔"

"مشرق ہی سے ہوتا ہے۔" ثمرہ نے کہا تو وہ روانی میں بولا تھا۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔" سب کے بے ساختہ قہقہوں سے وہ بوکھلا گیا تھا۔

"بس عمر! اب اور کچھ مت کہنا۔ کیونکہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔" نبیل نے دھیرج سے عمر کو ٹوکا تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں نبیل بھائی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ اس لڑکی سے پانی مانگو تو کورا جواب ملتا ہے۔ خود پی لو کہاں چائے آخر اس میں یہ انقلاب آیا کیسے؟"

"کیسے آیا۔" نبیل خود حیران تھے۔ اسے کیا جواب دیتے۔ بس ذرا سے کندھے اچکا کر مدیحہ کو دیکھنے لگے پھر رات دو بجے تک یہ محفل جمی رہی اور آسیہ کے کہنے پر ہی سب اٹھے تھے۔ مدیحہ ڈرائنگ روم اور لابی کی لائٹس آف کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو آگے صباحت کو بیٹھے دیکھ کر تعجب سے بولی۔

"بائیں! تم جاگ رہی ہو؟"

"اتنے شور میں بھلا میں سو سکتی تھی۔" صباحت اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے ناراض تھی۔

"تو کیا چاہتی ہو تم۔ خاموشی سے ہم تمہیں رخصت کر دیں۔" وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی۔

"ناراض کیوں ہوتی ہو۔ یہ تو میری خوشی ہے اگر اچھا نہیں لگ رہا تو کل سے نہیں بجے گی۔ ڈھولک۔ ڈھولک۔" وہ کہتی ہوئی دوسری طرف کروٹ بدل گئی۔ جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ صباحت پہلے ایک دم خاموش سی ہو کر اسے دیکھے گئی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

"مدحو! ادھر میری طرف دیکھو۔" اس نے دیکھا نہ کچھ بولی۔

"مدحو! کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم رو رہی ہو ناں۔" صباحت کو اس کا رونا محسوس ہو رہا تھا۔ جب ہی بے چین ہو کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"تم رو رہی ہو ناں مدحو، تم رو رہی ہو ناں۔"

"ہاں۔" وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی تو صباحت نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا لیا اور اس کے سر پر اپنی پیشانی ٹکاتی ہوئی بولی۔

"مت رو مدحو! مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔ میری بات بری لگی ہے تمہیں یا کسی اور نے کچھ کہا ہے؟"

اس نے آہستہ سے سر اونچا کیا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

"کسی نے کچھ نہیں کہا۔"

"پھر؟"

"بس میرا دل چاہ رہا تھا رونے کو۔" اس نے کہا تو صباحت کچھ دیر تک اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

"پتا ہے بنا کسی بات کے رونے کو دل کب چاہتا ہے۔ جب اندر کوئی احساس جاگتا ہے یا کوئی درد۔"

اس کی بھیگی آنکھوں میں کچھ تحیر سمٹ آیا تھا۔

"میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔ اس احساس، اس درد کا نام ہے محبت۔" صباحت نے معنی خیز شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔

"مجھے پتا ہے۔"

"واقعی پھر جلدی سے بتاؤ کون ہے؟" صباحت نے خوش ہو کر پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔"

"انجان مت بنو مدحو! میں بہت دنوں سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں۔ باتیں کرتے کرتے کھو جاتی ہو۔ آنکھوں پر چونکتی ہو اور صبح تو میں نے تمہیں اپنے آپ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جبکہ ابھی رو رہی تھیں بنا کسی بات کے۔

یہ ساری علامات ظاہر کرتی ہیں کہ کسی مسافر نے تمہارے دل کی کشتی میں ٹھکانا کر لیا ہے۔" صباحت کچھ بھلے بھلے انداز میں اس پر گرفت کر رہی تھی۔

"لیکن مدحو! اب تم کوئی دھوکا مت کھانا۔ پہلے دیکھ لینا کہ اس کی محبت میں کتنی سچائی! کتنی ایمانداری ہے۔"

"سچائی ہی سچائی، ایمانداری ہی ایمانداری۔" وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔

"میں حیران ہوں کہ میری تمام تر خامیوں، میری فطرتوں اور عادتوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتا رہا، کرتا ہے۔ میں اس کی نفی کرتے کرتے ہار گئی صبا! وہ محبت کا آسمان ہے۔ جانے کب سے اس نے میری لئے اپنی بانہیں وا کر رکھی ہیں۔ میں سر اٹھا کر اسے دیکھ سکتی ہوں لیکن چھو نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت کمزور، بہت حقیر لگنے لگا ہے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں صبا! پھر تم کیوں، اسے مجبور کرتی ہو کہ وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔"

❁ ❁ ❁

شاہ سکندر کے لئے شاہ یونس کا آنا اور مدیحہ کے لئے شاہ تیمور کا پرپوزل دینا دونوں باتیں ہی غیر متوقع تھیں لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا کیونکہ شاہ یونس سب سے بڑے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس لئے انہیں صاف جواب بھی نہیں دے سکے اور یہی کہا کہ وہ مدیحہ کی ماں سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔ پھر ان کا ارادہ تو نہیں تھا اس سلسلے میں آسیہ سے بات کرنے کا لیکن یہ سوچ کر شاہ پور میں قیام کے دوران ہو سکتا ہے۔ مدیحہ اور شاہ تیمور کے درمیان انڈر سٹینڈنگ ہوئی ہو، انہوں نے آسیہ سے بات کر لینا ضروری سمجھا۔ ان کے خیال میں اگر آسیہ اس رشتے پر راضی ہوئی تو پھر صباحت کے ساتھ ہی مدیحہ کی شادی بھی کر دیں گے، اس لئے انہوں نے جلدی کی تھی اور اس شام آسیہ کے ٹھکانے پہنچ گئے تھے۔

اس بار آسیہ نے ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں اپنے کمرے میں انہیں بلا لیا تھا اور ابتدائی

رسمی جملوں کے بعد ان کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

"میں ہدیہ کی بات کرنے آیا ہوں۔ آئی مین ان کی شادی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"صبا کے بعد۔" آسیہ نے بہت مختصر اجواب دیا۔ تو وہ قدرے رک کر پوچھنے لگے۔

"کوئی ہے آپ کی نظر میں اس کے لئے کیا؟"

"ہے میرا بھتیجا نبیل۔" وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"نبیل۔" انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے۔ "او کے ایز یو لائک، ویسے میں بھی ایک پرپوزل لایا تھا لیکن میرا خیال ہے۔ اب اس کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے یا آپ جاننا چاہیں گی؟"

"بالکل نہیں۔ آئی ایم سوری۔"

"تو سوری، بھول جائیں کہ میں نے آپ سے ایسی کوئی بات کی ہے۔" وہ کہہ کر فوراً موضوع بدل گئے۔

"پھر کیا خیال ہے؟" انہوں نے کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن یہاں رنگ ہیں نہ خوشبو اور موسم کا بھی پتا نہیں چل رہا۔ کیا خیال ہے کہیں باہر چلیں، کھلی فضا میں کھلے آسمان تلے۔"

آسیہ فوراً جواب نہیں دے سکی اور سوچنے کے بعد بھی شش و پنج میں تھی۔ انہوں نے اپنا اسٹر جو بے خیالی میں اس کی ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے گویا چلنے کا اشارہ دیا تھا پھر ٹھہر کر گویا ہوئے۔

ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے، دیکھ تو آئیں
چلو اس شہ کو اک بار پھر سے دیکھ تو آئیں

آسیہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اٹھتی ہوئی بے ساختہ گویا ہوئی تھی

بہت دن سے سمندر کی ہوا کم سم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رخ پر سفینے دیکھ تو آئیں

"تھینکس۔" شاہ سکندر کی نظروں میں تشکر تھا اور ممنونیت کہ اس نے ان کا مان رکھ لیا تھا۔

گو کہ رات اتر آئی تھی پھر بھی انہوں نے گاڑی ساحل کے قریب جا کر روکی تھی۔ اندھیرے میں سمندر نظر نہیں آرہا تھا لیکن لہروں کا شور اس کے ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

شاہ سکندر جتنے سرشار آئے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر انہیں شدید دھچکا لگا تھا اور بیٹھتے ہوئے بے اختیار کہہ گئے۔

"یہاں سے ہم جدا ہوئے تھے۔"

آسیہ نے چونک کر پہلے انہیں دیکھا پھر اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں یک لخت دھندلا گئی تھی۔

"بہت مشکل ہے قرار، کم از کم اس شہر میں تو ناممکن۔ قدم قدم پر یادیں بکھری پڑی ہیں۔" شاہ سکندر نے کہہ کر گہری سانس کھینچی تھی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔

خاموشی کا تو نام ہوتا ہے
ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے
آنکھ سے آنکھ نہیں ملتی

دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے

اور یہاں دل بول رہے تھے۔

جذبے بول رہے تھے جو وقت اور عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔

بیس برسوں میں کس پر کیا بیتی؟ ہوائیں پوچھ رہی تھیں۔

آسیہ کی نظریں تاریک آسمان پر دور تک بھٹکنے لگیں۔ کہیں کوئی ستارہ نہیں تھا۔

چاند نہیں کہاں چھپ گئے تھے وہ سب تارے جو اس کے رت جگوں کے امین تھے۔ وہ چاند جو اس کے آنسوؤں پر کبھی مسکراتا اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

وہ کہکشاؤں کی راہ گزر جہاں ہر قدم پر اس سے ایک ہی سوال ہوتا۔ تیرا ہم سفر کہاں ہے۔

کیسی دھند تھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"آسیہ۔" شاہ سکندر نے دھیرے سے پکارا تھا۔

"وہ ذرا سا چونکی پھر ان کی طرف متوجہ تو ہو گئی لیکن انہیں دیکھا نہیں۔"

"ایک بات پوچھوں؟" شاہ سکندر براہ راست اسے دیکھتے ہوئے کترا رہے تھے۔

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ قدرے رک کر بولے تھے۔

"تم نے پھر شادی کیوں نہیں کی؟"

"کیا سننا چاہیں گے۔ سچ یا جھوٹ؟" وہ اپنی انگلی میں دانست گولڈ کے رنگ کو بہت دھیرے دھیرے گھما رہی تھی۔ اس کی نظریں بھی اس پر جمی تھیں۔

"جو تم آسانی سے بول سکو۔" شاہ سکندر نے کہا تو اس نے ایک دم سر اونچا کر کے انہیں دیکھا پھر دکھ سے گویا ہوئی۔

"آسانی سے تو ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ بچیوں کی خاطر۔ ہر وہ عورت جو ایسے کسی المیے سے دوچار ہوتی ہے، وہ یہی کہتی ہے اور شروع تو یہی سچ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے عورت اپنے لئے سوچنے لگتی ہے لیکن اس کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بچوں کے ساتھ کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ بچوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی، یوں بقیہ ساری زندگی ایک ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں گزر جاتی ہے جو اس کے بچوں کو بھی تحفظ دے سکے اور ایسے شخص ہزاروں نہیں لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔"

شاہ سکندر بغور اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ "غالباً" سانس لینے کو رکی تھی کہ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گئے۔

"تم"

"نہیں۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ حالانکہ میرے ماں باپ، بھائیوں اور بھاوجوں نے بہت چاہا اور وہ جو لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے وہ بھی خود چل کر میرے پاس آیا۔ وہ بہت ناس، بہت فیئر تھا لیکن۔"

وہ بولتے ہوئے کچھ کھوسی گئی تھی۔

لیکن شاہ سکندر کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔

"میرا دل نہیں مانا کہ میں اس کے ساتھ خیانت کروں۔ اس کے سچے جذبوں کے ساتھ بے ایمانی

کروں۔ کیونکہ اپنے دل کی بستی سے میں نے وہ سارے پھول خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے تھے جن کی آبیاری میں میری ساری محبتیں شامل تھیں، اور محبتیں تو فنا نہیں ہوتیں شاہ سکندر!

انسان فانی ہے، روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے، اس کے لئے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا پھر میں ایسی کوشش کیوں کرتی۔

کیا ہوا جو دل کی بستی اجڑ گئی۔

کیا ہوا جو قربتیں فاصلوں سے بدل گئیں۔

یہ سب تو وقت کی ادائیں ہیں۔

کبھی دے جاتا ہے۔

کبھی لے جاتا ہے۔

یہی زندگی ہے۔

اور زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ مچولی کھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔

اور میری روح میں جو محبت رچ بس گئی اسے نکال پھینکنے پر میں قادر ہی نہیں تھی۔ پھر کیسے میں کسی اور کا ہاتھ تھام لیتی؟ یہ تو سراسر بے ایمانی ہوتی۔ اس کے ساتھ خود اپنے ساتھ اور اس بے ایمانی پر میری محبت روتی، تڑپ سکتی۔ نہیں یہ مجھے منظور نہیں تھا۔"

شاہ سکندر اپنی جگہ، بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ نظریں اس محبت و وفا کی دیوی پر جم کر رہ گئی تھیں اور سماعتوں میں صرف اس کی آواز تھی۔ جیسے کائنات میں بس ایک وہی سچ ہے، وہی حقیقت، باقی سب فریب۔

جانے ایک طویل خواب کے بعد کے بعد اب بیداری کا وقت آیا تھا۔

یا۔

ساری عمر جاگتے جاگتے تھکی ہوئی آنکھوں میں اب نیند اتری تھی۔ کچھ بھی ہو یہ لمحے خواب یا حقیقت، زندگی کا حاصل تھے ان کے سینے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا تھا۔

"اے وقت بس اب ٹھہر جا۔ اس سے آگے اب کچھ نہیں ہے۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش۔

نہ رنگ نہ ترنگ

تو اب کس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلے گا

زندگی تو بس یہیں تک تھی

اس کے بعد روح کا سفر ہے اور تو روح کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔

کہہ دے اس بے درد دنیا سے کہ

روح سے روح کا ناتا جڑ گیا ہے اب اسے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تو بھی نہیں، تو بھی نہیں۔

ان کے سینے میں درد بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

"آسی" ساری توانائیاں صرف کرنے بھی ان کے ہونٹوں سے بہت مدھم آواز نکلی تھی۔ پھر بھی آسیہ نے فوراً سر اونچا کیا اور انہیں سینے پر ہاتھ رکھے جھکتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"سکندر! سکندر!" بے حد پریشان ہو کر وہ انہیں پکارنے لگی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

پھر بھی اس نے بہت ہمت کر کے انہیں گھسیٹ کر وہیں پتھریلی زمین پر لٹا دیا اور اس کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر زور زور سے دبانے کے ساتھ مدد کے لئے لوگوں کو پکارنے لگی۔

ادھر ادھر سے کافی لوگ جمع ہو گئے، کسی نے موبائل پر ایمبولینس بلائی۔

اور ایمبولینس کے آنے تک وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف رہی تھی۔

* * *

ایک ایک پل قیامت تھا۔ اس کی نظریں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ ذہن اور دل دونوں ہی کسی نامعلوم شکنجے میں جکڑے گئے تھے۔ جب ہی ہونٹوں پر کوئی دعا نہیں تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر نے آ کر اسے متوجہ کیا تب بھی وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا تو اس کا سر آپ ہی آپ نفی میں ہل گیا۔

"کسی کو بلالیں۔" ڈاکٹر نے پھر کہا تو اس کا سہما ہوا دل مزید سہم گیا۔ بہت کوشش کر کے بولنا چاہا تو بس ایک ہی لفظ کہہ سکی۔

"ک.....کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیں۔"

"م.....میں ٹھیک ہوں، آپ بتائیں وہ....." اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"دعا کریں۔" ڈاکٹر اسی قدر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"دعا" اس کے احساسات پر جیسے کوئی جھنجوڑنے والی ضرب پڑی تھی، اور دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میرے اللہ، میرے اللہ" اس سے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یونہی اللہ اللہ کا ورد کرتے ہوئے اس نے پی سی او کا رخ کیا۔ پھر گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ کتنی دیر بعد ریسیور اٹھنے کے ساتھ ہی ڈھولک کی آواز نے اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا کر دی تھی۔ اس کے بعد عالیہ بولی تھی۔

"ہیلو.....ہیلو....."

"میرے خدا" اس نے آہستہ سے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد علی جہانگیر کے نمبر ڈائل کئے تو ادھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی آواز آئی تھی۔

"یس.....علی جہانگیر۔"

"علی! یہ میں ہوں، آسیہ۔" وہ کسی طرح اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"آنی آنٹی! خیریت؟" علی جہانگیر نے اس کی بدلی ہوئی آواز سے ٹھٹک کر پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے بیٹا!" میں یہاں کارڈیو سے بول رہی ہوں۔ تم اگر آسکتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔"

"میں آ رہا ہوں آنٹی! آپ پریشان نہیں ہوں اور پلیز یہ تو بتائیں کہ کون....."

"بس تم آ جاؤ۔" اس نے علی جہانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا اور فون رکھ دیا۔ پھر کوریڈور تک آتے آتے اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"میرے اللہ۔ میری بچیوں کو اب ان کا باپ ملا ہے۔ ان کے سروں پر یہ سائبان سلامت رکھنا۔" اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے پھر ان ہی ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا کیونکہ آنسو روانی سے چھلک گئے تھے اور اس تیزی سے اس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے تھے۔ ساری دعائیں اس شخص کے لئے تھیں جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بہت کچھ تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد علی جہانگیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔

"آنٹی!"

اس نے چونک کر ہاتھ نیچے گرائے تو اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیاں دیکھ کر علی جہانگیر مزید پریشان ہو گیا۔

"آنٹی پلیز! بتائیں کیا ہوا ہے۔ صباحت اور مدیحہ۔"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"پھر کون ہے یہاں؟" وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ رک رک کر بولی۔

"شاہ سکندر۔"

"سکندر چچا۔ کیا ہوا ہے انہیں؟" علی جہانگیر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں کو زور سے دبا گیا تھا۔

"ہارٹ" وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"اوہ گاڈ!" علی جہانگیر کے ذہن میں کتنے سوال ابھرے۔ کب، کہاں، کیسے لیکن اس کی حالت کے پیش نظر اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"سب ٹھیک ہو گا آنٹی! آپ پلیز خود پر قابو رکھیں، میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔"

"سنو! میرے گھر فون کر کے نبیل سے کہنا یہاں آ جائے۔ خیال رکھنا مدیحہ اور صبا کو ابھی معلوم نہیں ہونا چاہئے۔"

"جی بہتر۔" وہ تسلی کے انداز میں اس کے ہاتھ تھپک کر پہلے کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود نرس سے ڈاکٹر کا معلوم کر کے فوراً اس طرف چل پڑا۔

راہداری میں تیسرے دروازے پر ڈاکٹر اکرام اللہ کے نام کی تختی دیکھ کر اس نے اس دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور "کم ان" کی آواز پر اندر داخل ہو کر بولا۔

"السلام علیکم سر!"

"وعلیکم السلام۔" جواب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جیب سے اپنا کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"مسٹر شاہ سکندر حیات میرے چچا ہیں۔"

"اوہ" ڈاکٹر نے ہونٹ سکیڑ کر اس کے کارڈ پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

"بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ دعا کریں۔" اس بات کے جواب میں وہ کیا کہتا۔ چپ چاپ انہیں دیکھے گیا۔

"ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آگے زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ دعا کریں ان کی زندگی ہو۔"

"آمین!" اس نے ٹیبل پر ہاتھ جما کر گویا خود کو سہارا دیا پھر ٹیلی فون کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے ساتھ ٹیلیفون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔

"تھینک یو۔" اس نے بیٹھتے ہی آسیہ کے گھر کے نمبر ڈائل کئے اور اس کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ ریسیور اٹھتے ہی ڈھولک کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو ایک لحظہ کو وہ چکرا گیا کہ جہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ وہاں وہ یہ خبر کیسے دے؟

"ہیلو ہیلو۔" اس بار ادھر سے نبیل بول رہے تھے۔

"السلام علیکم نبیل بھائی! میں علی جہانگیر۔" وہ بہت سنبھل کر بولا۔

"خیریت، علی اس وقت کیسے فون کیا؟" رات کے دو بجے نبیل کی تشویش فطری تھی۔

"بس نبیل بھائی خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ ابھی کسی سے کچھ نہیں کہیں اور فوراً کارڈیو آ جائیں۔ سکندر چچا کو سیریس اٹیک ہوا ہے۔ آنٹی آسیہ بھی یہیں ہیں۔"

اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ کر ان کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر شاہ پور کے نمبر ڈائل کرنے لگا، کیونکہ ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اس لئے اس نے بابا جان کو اطلاع کرنی ضروری سمجھا تھا۔

"ہیلو۔" کتنی دیر بعد بابا جان کی نیند میں ڈوبی آواز آئی تھی۔

"السلام علیکم بابا جان! میں علی بات کر رہا ہوں۔"

"علی!" بابا جان کو شاید بیدار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ "ہاں علی! کیا بات ہے؟"

"وہ بابا جان" وہ اسی قدر کہہ سکا۔

"ہاں کہو، ہم سن رہے ہیں۔ کیا پھر تمہاری شادی میں کوئی۔۔۔"

"میری شادی کو گولی ماریں بابا جان! بس آپ فوراً یہاں آ جائیں، سکندر چچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔

"ک۔۔۔ کیا ہوا ہے اسے؟" بابا جان اب ٹھٹکے تھے۔

"آپ آ کر دیکھ لیں۔" وہ ہارٹ اٹیک کا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"پہلے ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔" بابا جان دھاڑے تھے۔

"ڈاکٹر ہی کے پاس ہیں، کارڈیو میں۔ آپ کو آنے میں تین گھنٹے لگیں گے بابا جان۔" اس نے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔

"ہاں، ہاں ہمیں معلوم ہے۔ ہم بس ابھی آ رہے ہیں۔ تم سکندر کے پاس رہو۔"

"ان ہی کے پاس ہوں۔" اس نے کہہ کر فون رکھ دیا پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے ان کے کمرے سے نکلا تو راہداری ہی میں نبیل مل گئے۔

"کیسے ہیں انکل سکندر؟" نبیل نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ بس ڈاکٹر کے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

"دعا کریں، چوبیس گھنٹے خیریت سے گزر جائیں۔"

"اتنی سیریس کنڈیشن ہے؟"

"ہوں۔" اس نے ہوں کی صورت گہری سانس خارج کی پھر انہیں لے کر آسیہ کے پاس آ گیا۔

آسیہ نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

"پھوپھو!" نبیل نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "آپ بہت بہادر ہیں پھوپھو! آپ کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ اللہ چاہے گا انکل بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

آسیہ کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو پھر قطرہ قطرہ اس کے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے۔

"روئیں نہیں پھوپھو پلیز۔" نبیل نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"مدحو اور حبا اپنے باپ سے مل کر کتنی خوش تھیں۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ان کی یہ خوشی قائم رہے گی انشاء اللہ۔" نبیل نے فوراً کہا تو وہ دل میں آمین کہہ کر پوچھنے لگی۔

"تم نے انہیں بتایا تو نہیں؟"

"نہیں البتہ خلیل چچا سے کہہ آیا ہوں۔" نبیل اسے جواب دے کر علی جہانگیر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"علی! بیٹھ جاؤ یار، تھک جاؤ گے۔"

"آنٹی تھک گئی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ انہیں گھر لے جائیں۔" علی جہانگیر نے رک کر کہا تو نبیل نے آسیہ کو یوں دیکھا جیسے جل رہی ہو۔

"نہیں بیٹا! جب تک ڈاکٹر اطمینان نہیں دلاتے میں نہیں جا سکتی۔" آسیہ کا جواب سن کر علی جہانگیر نے مزید کچھ نہیں کہا اور اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر ٹہلتا ہوا آگے چلا گیا۔

پھر جس طرح وہ بار بار گھڑی دیکھنے کے ساتھ ریلنگ سے نیچے جھانک رہا تھا اس سے نبیل سمجھ گئے، اسے کسی کا انتظار ہے اور ان کا ذہن شاہ جہانگیر کی طرف گیا تھا۔ اس لئے وہ بھی لاشعوری طور پر ان ہی کا انتظار کرنے لگے۔ آسیہ کو بھتی قرآنی آیات یاد تھیں ان کا ورد کرنے میں لگ گئی تھی۔

پھر فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی بابا جان کی آمد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ شاہ جہانگیر تھے۔

نبیل نے دور ہی سے شاہ جہانگیر کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھنا چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ بابا جان کو دیکھ کر وہ قدرے خائف سے ہو گئے اور دوبارہ بیٹھ کر آسیہ کو متوجہ کرتے ہوئے بولے۔

"پھوپھو! شاہ پور سے لوگ آ رہے ہیں۔"

آسیہ نے چونک کر سر اونچا کیا تو اس کی پہلی نظر ہی بابا جان پر پڑی تھی۔ گو کہ اس سے پہلے اس نے انہیں نہیں دیکھا تھا پھر بھی وہ انہیں پہچان سکتی تھی۔ اونچا شملہ سر پر سجائے اس وقت وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ ان کی چال بھی بہت دھیمی تھی۔ اس نے بہت خاموشی سے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا پھر سرگوشی میں نبیل سے بولی۔

"گھر چلو نبیل! اذان ہو رہی ہے۔ نماز گھر میں پڑھوں گی۔"

* * *

بابا جان نے بہت چاہا کہ وہ ایک نظر ہی شاہ سکندر کو دیکھ لیں ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔ تب وہ

بہت مایوس ہو کر اس جگہ آ بیٹھے تھے جہاں کچھ دیر پہلے آسیہ بیٹھی تھی اور وہ تو نہیں البتہ شاہ جہانگیر آسیہ کو دیکھ چکے تھے اس لئے بابا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اشارے سے علی سے پوچھا کہ آسیہ کہاں گئی؟ جواب میں اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"کون لایا تھا سکندر کو یہاں؟" بابا جان نے علی کو دیکھ کر پوچھا تو وہ بہت سنبھل کر بولا۔

"چچا نہیں بابا جان۔"

"تمہیں کیسے خبر ہوئی تھی؟"

"میرے پاس فون آیا تھا، رات ایک بجے کے قریب کہ شاہ سکندر کو ایک حادثہ ہوا ہے اور وہ کارڈیو میں ہیں۔ بس اتنا سن کر ہی میں بھاگا چلا آیا۔ پھر ڈاکٹر سے ان کی کنڈیشن معلوم کرنے کے بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔" وہ پورے دھیان سے بابا جان کی طرف متوجہ تھا تاکہ ان کی ہر بات کا جواب دے سکے۔

"اس کے گھر میں خبر ہے، مہر النساء اور بچوں کو؟" بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اگر ہوتی تو مہر النساء چچی یہاں موجود ہوتیں۔"

"ہوں۔" بابا جان ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگے۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

علی جہانگیر نے کوئی جھوٹی آس دلانے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

"جاؤ معلوم کرو ڈاکٹر سے۔ اگر اس کے بس میں نہیں ہے تو ہم باہر لے جاتے ہیں سکندر کو۔ جاؤ جہانگیر تم بات کرو۔" بابا جان کو علی کی خاموشی بری طرح کھٹکی تھی۔

"صبر سے بابا جان! صبر سے۔ ایسی حالت میں ہم سکندر کو کہیں نہیں لے جا سکتے۔ ویسے اس طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ یہاں بہت قابل ڈاکٹر موجود ہیں۔" شاہ جہانگیر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ قابل ڈاکٹر ہمیں دیکھنے کیوں نہیں دے رہے۔" بابا جان ٹوک رہے تھے۔ "ایک نظر ہمیں ہمارے بچے کو دکھا دو، بہت بیمار ہو کر آیا تھا وہ ہم سے۔ ہمیں اسے منا لینے دو۔"

"بابا جان! بابا جان پلیز۔" علی جہانگیر نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ "حوصلے سے کام لیں، چچا جان ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہونا ہے اسے۔ اس کی بیٹی کی شادی سر پر کھڑی ہے۔ جاؤ، بتاؤ اسے ہم آئے ہیں۔ اس کی بیٹی کو رخصت کرانے۔" بابا جان یکدم لاچار بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

علی جہانگیر کے لئے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تو آہستہ سے ان کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا راہداری میں نکل آیا۔ لیکن اس کا دھیان ابھی بھی بابا جان کی طرف تھا۔ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے والے اب تقدیر کے سامنے کس قدر بے بس ہو گئے تھے۔ سب آن بان شان دھری رہ گئی تھی۔

آخر انسان سمجھتا کیوں نہیں۔

کہ تقدیر کے آگے کوئی تدبیر نہیں چلتی۔

خود کو خدا سمجھنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔

اور خدا تو بڑے بے نیاز ہے اور اسی قدر باخبر۔

اس سے کچھ پوشیدہ نہیں۔

وہ سب دیکھتا ہے سب جانتا ہے۔

جانے انسان کس زعم میں ہے۔ سمجھتا ہی نہیں لیکن کب تک؟ وہ ایک حد تک ہی رسی دراز کرتا ہے۔

حالانکہ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ چاہے تو وہ لمحوں میں ہی گرفت کرے۔ لیکن وہ بندوں کو موقع دیتا ہے بار بار

یہ اس کی شان ہے

اور اس شان والے سے کون لڑ سکا ہے؟

کوئی نہیں

اس کے سامنے سب بے بس ہیں۔

کوئی مان لیتا ہے اور کوئی نہیں مانتا اور جو نہیں مانتا اس سے وہ یوں منواتا ہے۔

وہ یوں ہی سوچتا ہوا باہر نکل کر آیا تو اس کا دل چاہا یہاں سے کہیں بہت دور چلا جائے جہاں نہ کوئی بے بس ہو نہ کوئی اتنا بااختیار۔ سب کے دکھ سکھ ایک جیسے ہوں۔ شاید بابا جان کی بے بسی پر رحم آنے لگا تھا۔ اس لئے وہ وہاں رک نہیں سکا اور گھر چلا آیا۔

عارفہ بیگم اس کے بارے میں کرم دین سے سوال جواب کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو اس پر ناراض ہونے لگیں۔

"یہ رات میں کون سی ڈیوٹی ہوتی ہے تمہاری اور مجھے بتا کر نہیں جا سکتے تھے۔"

"آپ سو رہی تھیں۔" وہ تھکا تھکا سا صوفے پر ڈھے گیا۔

"اب تو جاگ رہی ہوں۔ اب بتاؤ، کہاں سے آ رہے ہو؟" عارفہ بیگم اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

"کرم دین! ایک تھرماس چائے اور ناشتے کا ٹفن تیار کرو، جلدی۔" اس نے پہلے کرم دین کو مخاطب کر کے کہا پھر عارفہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں رات ہاسپٹل میں تھا، سکندر چچا کے پاس۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ہائیں۔ اسے کیا ہوا؟" عارفہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ "بتاؤ ناں، کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟"

"بس امی دعا کریں۔ شاہ پور سے بابا جان بھی آ گئے ہیں۔ وہ بھی ہاسپٹل میں ہیں ابا کے ساتھ۔ میں نے رات انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ البتہ سکندر چچا کے گھر میں ابھی کسی کو پتا نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں ڈرائیور کے ساتھ مہر النساء چچی کے پاس چلی جائیں لیکن انہیں کچھ بتایئے گا نہیں، جب تک میں فون کر کے آپ کو چچا جان کی خیریت سے آگاہ نہ کر دوں۔" وہ جیسے بہت سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو علی!" عارفہ بیگم کا دل ہولنے لگا تھا۔

"افوہ آپ تو... بس آپ کہیں نہیں جا رہیں، یہیں بیٹھی رہیں۔" وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کرم دین سے "ٹفن جلدی کرو میں دو منٹ میں شاور لے کر آتا ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" عارفہ بیگم نے کہا لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے ہی کرم دین کو پکارتا ہوا نکلا تو آگے عارفہ بیگم تھرماس اور ٹفن لئے کھڑی

تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے ساتھ جانے سے روکا اور ان کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے کر جلدی سے باہر نکل آیا۔

شاہ جہانگیر راہداری میں ٹہل رہے تھے اور بابا جان پتا نہیں کہاں تھے؟ وہ ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا شاہ جہانگیر کو پکار کر پوچھنے لگا۔

"ابا! بابا جان کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر کے کمرے میں۔ تم نے ناحق انہیں بلا لیا۔ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" شاہ جہانگیر نے جواب دینے کے ساتھ کہا تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"پریشانی کی بات تو ہے۔ چلیں آپ بھی ادھر ہی چلیں، میں آپ کے لئے ناشتا لایا ہوں۔ کسی طرح بابا جان کو بھی کچھ کھلا دیں۔"

"تم کوشش کر دیکھو، مجھے تو منع کر چکے ہیں۔" شاہ جہانگیر نے کہا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے میں آئے تو آگے بابا جان بڑی عاجزی سے شاہ سکندر کو ایک نظر دیکھنے پر اصرار کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کے مسلسل اصرار سے تنگ ہو رہے تھے جب ہی شاہ جہانگیر کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"پلیز آپ انہیں گھر لے جائیں۔ جب مریض کو ہوش آئے گا تب میں خود انہیں کال کر لوں گا۔"

شاہ جہانگیر نے یوں سر ہلایا جیسے یہ نہیں جائیں گے پھر آگے بڑھ کر بابا جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"بابا جان! دیکھیں علی آپ کے لئے گھر سے ناشتا لایا ہے۔"

"پہلے ہم سکندر کو دیکھیں گے۔" بابا جان کی اپنی ضد تھی۔

"اوکے! میں ڈاکٹر صدیقی سے پوچھتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دیں گے تو۔" ڈاکٹر اکرام اللہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ "چلو ہمیں لے چلو ڈاکٹر صدیقی کے پاس۔" بابا جان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

❁ ❁ ❁

آسیہ کی رات تو کار ڈیوٹی میں آنکھوں میں کٹی تھی پھر گھر آ کر فجر کی نماز کے بعد وہیں جانماز پر کچھ دیر کو اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ بے چین بلی کی مانند سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ کبھی اپنے کمرے میں بند ہو کر جانماز بچھا کر بیٹھ جاتی اور کبھی بھاگ کر فون کا ریسیور اٹھاتی۔

نبیل کے کہنے پر میمونہ بھابھی نے مدیحہ اور صباحت کو نیچے بلا کر کسی کام میں مصروف کر دیا تھا۔ اس لئے وہ دونوں بالکل بے خبر تھیں ورنہ آسیہ کی حالت سے اگر وہ اصل بات تک نہ پہنچتیں تب بھی متوحش ضرور ہوتیں۔ اور پھر جاننے کی کوشش بھی کرتیں اور نبیل کے لئے ان کے بے تکے سوالوں کے جواب دینا بہت مشکل تھا کیونکہ ان کا اپنا ذہن بری طرح متاثر ہوا تھا۔ خاص کر آسیہ کی پریشانی ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ وہ اسے تسلی بھی نہیں دے پا رہے تھے نہ کچھ کھانے پر مجبور کر سکتے۔

دوپہر میں میمونہ بھابھی اوپر آئیں تو انہوں نے زبردستی آسیہ کو تھوڑا کھانا کھلایا۔

"کوئی فون نہیں آیا۔ پتا نہیں سکندر کیسے ہیں؟ انہیں ہوش آیا کہ نہیں؟"

"آ جائے گا ہوش اور وہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔" میمونہ بھابھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ "تم پہلے اپنے آپ کو تو سنبھالو اگر مدیحہ اور صبا نے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو۔"

"آپ نے انہیں بتایا تو نہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں بتایا لیکن اب بتانے جا رہی ہوں، کیونکہ کسی بھی وقت ان کا ہاسپٹل سے بلاوا آ سکتا ہے۔"

میمونہ بھابھی نے کہا تو اس نے چونک کر پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ان کے دادا کہہ سکتے ہیں کہ بچیوں کو باپ کے پاس ہونا چاہئے اور ایسی حالت میں ہم منع بھی نہیں کر سکتے، یا تم منع کرو گی؟" میمونہ بھابھی نے وضاحت کر کے پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم پہلے سے انہیں تیار کر لیں۔ میں ابھی انہیں بلا کر بتاتی ہوں کہ..."

دروازہ کھلنے کی آواز سے میمونہ بھابھی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئیں تب ہی نبیل اندر آئے اور کارڈلیس آسیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"پھوپھو! شاہ جہانگیر آپ سے بات کریں گے۔"

آسیہ نے جھجکنے کے انداز میں کارڈلیس لے کر کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو!"

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحبہ کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سکندر کا بتائیں انہیں ہوش آیا؟" وہ کسی طرح اپنی بے تابی چھپا نہیں سکی۔

"آپ کو بلانے کے لئے اس کا ہوش میں آنا شرط تو نہیں ہے۔ آئی سی یو میں وہ بے ہوشی میں بھی آپ ہی کو پکار رہا ہے۔" شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ کچھ بوکھلا کر میمونہ بھابھی کو دیکھنے لگی تھی۔

"ہیلو ڈاکٹر صاحبہ!" ادھر سے شاہ جہانگیر نے پکارا تب وہ سنبھل کر بولی۔

"جی فرمائیے!"

"آپ آ جائیں پلیز، اپنے مریض کے پاس۔" شاہ جہانگیر نے قطعی لہجے میں کہا۔

"میں...!" وہ کہنے جا رہی تھی کہ میں آ رہی ہوں، لیکن اچانک بابا جان کا خیال آنے پر ہونٹ بھینچ گئی جبکہ سماعتیں منتظر تھیں اور اس بار اس کی سماعتوں سے جو آواز ٹکرائی وہ شاہ جہانگیر کی نہیں تھی۔

"ہمارے سکندر کی ہر سانس تمہیں پکار رہی ہے۔ آس تم ہی ہو یہاں۔"

"کون؟" وہ بوڑھی کمزور آواز اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں الجھ گئی۔

"ہم شاہ حیات محمد۔" بابا جان جو ہمیشہ اپنا بتاتے ہوئے فخر سے گردن اکڑایا کرتے تھے اس وقت ان کا مجرمانہ سا انداز تھا۔

آسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے، کیا کرے۔ خود کو بے بس سی محسوس کر رہی تھی، بڑی مشکل سے خود کو سہارا دے کر بولی۔

"جی شاہ صاحب! کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"ہم کیا چاہیں گے، وہ جو چاہنے والا ہے وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی پکار پہ آؤ گی یا ہم فریاد کریں؟"

"جی نہیں آپ کو فریاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی سے کہہ کر

سلسلہ منقطع کر دیا اور کارڈلیس ایک طرف رکھ کر آنکھوں میں اتر آنے والی نمی انگلیوں سے صاف کرنے لگی۔

"کیا کہہ رہے تھے۔ جہانگیر۔ ہوش آ گیا سکندر کو؟" میمونہ بھابھی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔

"پتا نہیں بھابھی! کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔ میں... جا رہی ہوں، نبیل، مدحہ اور صبا کو بلاؤ انہیں بھی لے چلیں گے۔" وہ میمونہ بھابھی سے نظریں چرا کر بولتی ہوئی بیڈ سے اتر گئی۔

"انہیں کیوں لے جاؤ گی؟" میمونہ بھابھی نے ٹوکا۔

آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور نبیل کو اشارہ کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ نبیل کے ساتھ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو صباحت اور مدحیہ نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"کیا ہوا ہے پاپا کو؟"

"کہاں ہیں وہ اس وقت؟"

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"تم دونوں اگر اس طرح کرو گی تو میں یہیں اتار دوں گا۔" نبیل کی تنبیہہ پر دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں تو قدرے توقف سے آسیہ گردن پیچھے موڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! صبر اور حوصلے سے کام لو۔ تمہارے پاپا کارڈیو میں ہیں اور وہاں ان کے پاس تمہارے دادا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں، انہوں نے ہی ہمیں بلایا ہے۔"

"دادا یعنی بابا جان؟" صباحت نے خفیف نظروں سے مدحیہ کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

"مما! پاپا کو اٹیک ہوا ہے؟"

"ہاں۔" آسیہ نے اختصار سے کام لے کر اپنا رخ سیدھا کر لیا اور کچھ دیر آگے بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ جانے کچھ انجانے نقوش ابھرنے لگے۔

"بیٹا! اس وقت تمہیں صرف اپنے پاپا کا خیال کرنا ہے، انڈر اسٹینڈ۔"

"جی مما!" مدحیہ اثبات سے سر ہلا کر سامنے دیکھنے لگی۔

بابا جان شاہ جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھے بہت سست روی سے اسی طرف آ رہے تھے۔

"مما! وہ... بابا جان آ رہے ہیں۔" مدحیہ نے دھیمی آواز سے آسیہ کو متوجہ کر کے کہا۔

"ہاں، جاؤ ملو ان سے۔ صبا کو بھی لے جاؤ۔" وہ ان دونوں کو بھیج کر نبیل کو بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی وہیں سے پلٹ کر ڈاکٹر اکرام اللہ کے کمرے میں آ گئی۔

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحب! میں ڈاکٹر آسیہ صلاح الدین۔"

"جی، جی۔ میں نے کل رات ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ ڈاکٹر عبدالوہاب کے ہاسپٹل میں ہوتی ہیں۔"

"آپ کی یادداشت کی داد دینی پڑے گی ڈاکٹر صاحب! کیونکہ یہ بہت پرانی بات ہے تقریباً پندرہ سال پرانی۔"

اس نے کہا تو ڈاکٹر اکرام اللہ حیرت سے بولے۔

"واقعی۔"

"جی۔"

"اور اب آپ کہاں ہوتی ہیں؟"

"اپنے کلینک میں اور اس وقت میں اپنے عزیز شاہ سکندر حیات کو دیکھنے آئی ہوں۔" اس نے رہی گفتگو مختصر کر کے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"ہاں۔ رات آپ شاہ سکندر کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ آپ کے عزیز ہیں؟"

"جی۔ اب کیسے ہیں وہ؟"

"بہتر تو نہیں کہہ سکتا بہر حال خطرے سے باہر ہیں۔" ڈاکٹر اکرام اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"تھینک گاڈ۔" وہ ان کے ساتھ باہر آئی اور پھر آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے اس نے قصداً اس طرف نہیں دیکھا جہاں بابا جان اس کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھے تھے، جبکہ ان کی نظریں اسی پر تھیں اور وہ محسوس بھی کر رہی تھی پھر بھی انہیں دیکھے بغیر نکل آئی۔

شاہ سکندر کے چہرے پر آکسیجن ماسک فٹ تھا۔ سانسوں کے ساتھ ان کی بند پلکیں بہت دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔

وہ ان کے پیروں کے پاس رک گئی اور ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا کہ ان کی سانسوں میں بسی اس کے نام کی مہک نے سارے میں ہلچل مچا دی۔

"آس۔ آس۔"

اس کے احساسات پر نرم نرم پھوار پڑنے لگی تھی۔

انسان فانی ہے روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لئے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔

زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ مچولی کھیل لے، روح کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔

یہی کہا تھا ناں میں نے یہی سچ ہے اب وقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم اس کی آنکھ مچولی سے بہت آگے نکل آئے ہیں جہاں دنیاوی بندھن کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اے میری روح کے امین۔ اس نے ایک بار پھر ان کے پاؤں دبایا تھا۔

شاہ سکندر کی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور پھر نظریں اس وفا کی دیوی پر جم گئیں۔

کتنے لمحے سرک گئے۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ جانے کون سی دنیا کے در وا ہو رہے تھے۔

"آس!" اس بار شاہ سکندر کی آواز واضح تھی۔

وہ چونکنے کے ساتھ جیسے ہوش میں آ گئی۔ تب ہی اپنے سر پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

"کون؟" اس نے ذرا سی گردن موڑی اور اپنے ساتھ بابا جان کو کھڑے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔

بابا جان نے آہستہ سے اس کا سر تھپکا پھر شاہ سکندر کو آنکھیں بند کرتے دیکھ کر عاجزی سے بولے

"ہم سے روٹھو مت سکندر! ہم تمہاری خوشی پوری کرنے آئے ہیں۔ تمہاری بیٹی کو بہت شان سے

رخصت کرا کے لے جائیں گے۔ آس۔ بے او آس۔" شاہ سکندر سب سن رہے تھے لیکن انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں، کیونکہ بند پلکوں کے اندر آنے والے دنوں کا بڑا حسین تصور تھا جس کی دلکشی ان کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھی۔

* * *

"نبیل بھائی! آپ کو ماما بلا رہی ہیں۔" صباحت نے نبیل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"کہاں ہیں پھپھو۔" نبیل اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اپنے کمرے میں۔"

"چلو۔"

"مجھے نہیں آپ کو بلایا ہے۔ آپ جائیں۔" وہ کتابوں کے ریک کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"اچھا دیکھو ابھی یہاں سے کوئی کتاب مت اٹھانا۔" نبیل اسے تنبیہ کرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر آسیہ کے کمرے میں آ گئے۔

"جی پھپھو۔"

آسیہ جانے کس خیال میں تھی چونک کر انہیں دیکھا پھر اپنے برابر اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"آؤ بیٹا بیٹھو۔ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے تھے؟"

"نہیں پھپھو۔" نبیل بیٹھ گئے۔ "آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔"

"کام تو نہیں ہے البتہ ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی۔" نبیل پوری طرح متوجہ ہو گئے تو کچھ دیر رک کر وہ کہنے لگی۔

"یہ اس روز کی بات ہے جس دن شاہ سکندر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ میرے پاس آئے تھے۔ مدیحہ کا پرپوزل لے کر، شاہ تیمور غالباً ان کا بھتیجا ہے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم مدیحہ کو پسند کرتے ہو۔"

نبیل کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نے چھب دکھلائی تھی جس سے آسیہ مطمئن ہو کر بولی۔

"تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا اور نہ ہی تم اسے میری خواہش سمجھ کر پوری کرنے کی سوچنا۔ تم صرف اپنا سوچو۔"

"آپ نے مدیحہ سے پوچھا ہے، وہ کیا چاہتی ہے؟" نبیل نے اس کی یہ بات ان سنی کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

"وہ تمہیں چاہتی ہے۔" پھر فوراً ہی احساس بھی ہو گیا تو بات بناتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں پوچھا اور نہ پوچھوں گی کیونکہ وہ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ نہیں کر سکتی ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ میرے فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی۔"

"پھر بھی پھپھو! آپ اس سے پوچھ لیں۔" نبیل نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"یہ کام تم خود کر لو۔ اس کے بعد خود تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔" آسیہ نے بڑے آرام سے خود کو بری الذمہ کر لیا۔

"فیصلہ تو ہو چکا۔" نبیل نے سوچا پھر آسیہ کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آئے تو صباحت

خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

"کیا ہوا ہے نبیل بھائی؟ صباحت واقعی ڈر گئی۔"

"پھوپھو کو تم نے بتایا ہے؟" انہوں نے ایسے ہی خونخوار لہجے میں پوچھا۔

"کک... کیا؟"

"کہ میں مدحو کو پسند کرتا ہوں۔"

"نہیں، ایمان سے میں نے نہیں۔" وہ اپنی صفائی میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو کر ان کی بات پر غور کرنے لگی پھر چیخ پڑی۔

"ہائے نبیل بھائی! مما کو پتا چل گیا۔ سچ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آپ اور وہ مدحو بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ بہت ایک دوسرے سے چھپا لیا آپ دونوں نے لیکن مما دی گریٹ۔"

"شٹ اپ!" نبیل نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

"کوئی شٹ اپ وٹ اپ نہیں۔" وہ انہیں چڑاتی ہوئی بھاگ گئی۔

"نبیل بھائی۔" صباحت پھر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"مما کہہ رہی ہیں مجھے ہاسپٹل لے جائیں، پاپا کے پاس۔"

"کیا، وہاں مدحو ہے تو۔"

"مدحو ہے تو کیا مطلب۔ مجھے نہیں جانا چاہئے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے، مجھے بابا جان نے بلایا ہے۔ ابھی مما کے پاس ان کا فون آیا تھا۔" وہ تفصیل بتانے کھڑی ہو گئی۔

"اچھا چلو تم، میں آ رہا ہوں۔" وہ اسے ٹوک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ صباحت کے ساتھ شاہ سکندر کے پاس پہنچے تو انہیں کمرے میں مدیحہ نظر نہیں آئی جبکہ تمام راستے وہ اس کے بارے میں سوچتے آئے تھے۔ تب ہی کچھ بے چین سے ہو گئے اور شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے بے اختیار ان سے پوچھ لیا۔

"مدیحہ کہاں ہے؟"

"مدیحہ ابھی تو یہیں تھی۔" شاہ سکندر نے بابا جان کو دیکھا۔

"کون مدیحہ، وہ مہر النساء کے ساتھ نیچے اسٹور تک گئی ہے ابھی آتی ہو گی، تم بیٹھو برخوردار۔" بابا جان نے ان کے لئے اپنے برابر جگہ بنائی تو بیٹھتے ہوئے ان کی نظر صباحت پر پڑی جو انہیں دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"نان سینس" وہ اسے گھور کر فوراً شاہ سکندر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اب کیسی طبیعت ہے انکل آپ کی؟"

"پہلے سے بہتر ہے۔" شاہ سکندر نے مسکرا کر کہا تب ہی مدیحہ آ گئی اس کے پیچھے مہر النساء تھی جسے دیکھ کر نبیل اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر بولے۔

"السلام علیکم۔"

مہر النساء جواب دینے کے بجائے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی تو ان سے پہلے صباحت بول پڑی۔

"یہ نبیل بھائی ہیں آپی! ہمارے سب سے بڑے ماموں کے سب سے بڑے بیٹے۔"

"اچھا اچھا وعلیکم السلام۔" مہر النساء نے اب جواب دیا تو مدیحہ بے ساختہ ہنسی پھر فوراً ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

"بس چلتا ہوں، صبا کو چھوڑنے آیا تھا اور وہاں مدحو تم چلو میرے ساتھ۔" انہوں نے آخر میں ایک دم مدیحہ کو مخاطب کر کے کہا تو صباحت نے بھی فوراً ان کی تائید کی۔

"ہاں، مدحو! تم جاؤ نبیل بھائی کے ساتھ، پاپا کے پاس اب میں رہوں گی۔"

"نہیں نہیں۔" مدیحہ نے اسی قدر کہا تھا کہ بابا جان ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"باری باری ادھر الماس آنے کو تیار ہے۔ ویسے اب تین چار دنوں کی بات ہے پھر انشاء اللہ سکندر گھر جائے گا تو سب مل کر اس کی سیوا کر لینا۔ کیوں سکندر؟"

"جی!" شاہ سکندر اثبات میں سر ہلا کر مدیحہ اور نبیل کو دیکھنے لگے۔ اچانک انہیں آپریشن کی بات یاد آئی تھی، جب ہی کھو سے گئے تھے۔

"او کے انکل!" نبیل مصافحے کے لئے شاہ سکندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھنے لگے۔

"آپ کی اجازت ہے مدیحہ کو لے جاؤں؟"

"ہاں ضرور..." شاہ سکندر نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تھینک یو..." نبیل نے ان کا شکریہ ادا کر کے بابا جان سے مصافحہ کیا پھر مدیحہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

راہداری میں انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار آہستہ کر لی تھی پھر بھی اختتام تک پہنچ گئے تھے تب مدیحہ آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے رک کر اس کا انتظار کیا پھر اسے ساتھ لے کر باہر آئے تھے۔

"تین چار دن کی تو بات تھی، میں رہ جاتی پاپا کے پاس۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی مدیحہ نے انہیں سنا کر کہا۔

انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تو وہ سامنے سے کیسٹ اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر اسے رکھ کر دوسرا کیسٹ اٹھایا پھر تیسرا آخر میں مایوس سی ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

نبیل وقفے وقفے سے مرر میں اس پر نظر ڈال رہے تھے۔ اس کے رخ موڑنے پر انہوں نے ایک کیسٹ لگا کر آن کر دیا۔

دل نے یہ کہا ہے دل سے
محبت ہو گئی ہے تم سے
میری جان میرے دلبر میرا اعتبار کر لو
جتنا بے قرار ہوں میں، خود کو بے قرار کر لو

نبیل نے تو یونہی ایک کیسٹ اٹھا کر لگا دیا تھا اب یہ اتفاق تھا کہ گانے کے بول ان کے جذبوں سے ہم آہنگ بلکہ ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ اور یہ حسین اتفاق نہیں بڑا بھلا لگ رہا تھا، جب ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس موڈ میں نہیں تھے بلکہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔

اف یہ نبیل بھائی کو کیا ہو گیا ہے؟ اس نے اپنی شور مچاتی دھڑکنوں سے پریشان ہو کر سوچا۔ اچانک

ہمت کر کے اپنا رخ سیدھا کیا اور کیسٹ آف کر دیا تو ایک دم خاموشی چھا جانے پر تجمل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

اور دوبارہ ونڈ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

کچھ راستہ خاموشی سے کٹ گیا پھر باہر دیکھتے ہوئے وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟"

تجمل پتا نہیں کیوں خاموش تھے۔

"تجمل بھائی!" وہ ان کا بازو ہلانے لگی۔ "کہاں جا رہے ہیں؟"

"گھر... گھر... پر... گھر..." عجیب جواب تھا وہ الجھ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"کتنے حصوں میں بٹا ہوا ہوں میں، پتا نہیں میری جڑیں کہاں ہیں، کہیں بھی مضبوطی سے قدم جما کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔" تجمل بولنا شروع ہوئے تھے کہ خاموش ہونے کے ساتھ ہی گاڑی بھی روک دی۔ تو وہ گھر دیکھ کر بولی۔

"ارے یہ تو بڑے ماموں کا گھر ہے۔"

"ہاں میرے باپ کا گھر، اسے میں اپنا گھر نہیں کہتا، جیسے تم اپنے باپ کے گھر کو اپنا گھر نہیں کہتیں، یہ ایک قدر مشترک ہے ہم میں۔" تجمل نے کہہ کر ایک نظر اسے دیکھا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ ان کی بات میں الجھ گئی تھی جب ہی ٹوکا نہیں کہ وہ باہر ہی سے کیوں جا رہے ہیں اور ابھی وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی کہ پھر گاڑی رک گئی۔ اس بار سامنے عالیشان گھر تھا۔

"یہ...؟" اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

"یہ میری ماں کا گھر ہے، چلو تمہیں ان سے ملواؤں۔" تجمل کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے۔ پھر ہنبل کا ہارن پش کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا وہ خاصی حیران اور پریشان سی آ رہی تھی۔

"ارے تم تو یوں حیران پریشان ہو جیسے۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"بے وقوف...!" وہ مسکرائے اور گیٹ کھلنے پر اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئے۔

"ممی...!" لاؤنج میں رک کر انہوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ "روما، ممی کہاں ہیں آپ۔"

"تجمل بھائی، ممی! تجمل بھائی آئے ہیں۔" سامنے کے دروازے سے ایک لڑکی بھاگتی چلاتی ہوئی آ کر تجمل سے لپٹ گئی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"یہ کون ہے تجمل بھائی؟"

"مدحیہ میری پھوپھو کی بیٹی اور مدحو یہ میری بہن روما ہے۔" انہوں نے تعارف کرایا۔

"ہاؤ سویٹ، گلیڈ ٹو میٹ یو۔" روما کا حلیہ ہی نہیں لہجہ بھی انگریزی تھا۔

"تھینک یو۔" وہ کچھ خائف سی ہو گئی تھی جب ہی تو ہاتھ ملا کر پیچھے ہٹ گئی تب ہی نبیلہ ایک کمرے سے نکلتی ہوئی بولیں۔

"تجمل! کیسے ہو بیٹا! اتنے دنوں بعد آئے کہیں باہر چلے گئے تھے کیا؟"

"نہیں ممی! یہیں تھا، آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک یہ لڑکی؟" نبیلہ اسے دیکھ کر بولیں۔

"مدحو ہے، ممی، پھوپھو کی بیٹی۔"

"آسیہ کی، ارے یہاں آؤ بیٹی میرے پاس۔" نبیلہ نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا پھر اپنے ساتھ لے کر بیٹھیں تو پوچھنے لگیں۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟"

"جی ٹھیک ہیں۔"

"ارے...!" نبیلہ ان کی منمناتی آواز پر زور سے ہنسیں۔ "تم تو بالکل اپنی ماں جیسی ہو۔ ڈرپوک، بزدل۔"

"کیا؟" تجمل اچھل پڑے۔ "پھوپھو ڈرپوک، بزدل نہیں ہیں ممی۔"

"تمہیں کیا پتا، اس عمر میں ایسی ہی ہوتی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے جائز بات بھی نہیں کہہ سکتی تھی بہت ڈرتی تھی۔"

"لیکن یہ تو کسی سے نہیں ڈرتی ممی! الٹا سب اس سے ڈرتے ہیں۔" تجمل نے شرارت سے اسے دیکھا۔ وہ روہانسی ہو کر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ تب تجمل کو اس پر رحم آ گیا، موضوع بدل گئے۔

"سنی نظر نہیں آ رہا ممی۔"

"وہ اپنے پاپا کے ساتھ اٹلی گیا ہے۔"

"تم نہیں گئیں۔" تجمل نے روما سے پوچھا تو وہ ترنخ کر بولی۔

"جہاں سنی جائے گا میں کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"اوں ہوں، تمہیں سنی کے ساتھ ضد نہیں لگانی چاہیے، چھوٹا ہے وہ تم سے۔" تجمل نے نرمی سے ٹوکا۔

"یہ بات آپ اسے سمجھائیں۔"

"ارے ابھی تو آئے ہو، بیٹھو میں کھانا لگواتی ہوں۔"

"کھانا پھر کسی ابھی ہمیں آگے جانا ہے۔ چلو مدحو..." تجمل نے سہولت سے کھانے کو منع کر دیا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتے تھے کہ وہ خود ہی کھڑی ہو گئی۔

"اچھا بیٹی! اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اور تم پھر ضرور آنا۔" نبیلہ نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"جی..." وہ روما سے ہاتھ ملا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے تجمل کہہ گئے۔

"ممی آپ پوچھتی تھیں نا کہ میں کس سے شادی کروں گا تو آج آپ نے اسے دیکھ لیا۔ اچھی ہے ناں۔"

"بہت اچھی۔" نبیلہ سے پہلے روما بول پڑی۔ "میں بھی آؤں گی آپ کی شادی میں۔"

"ظاہر ہے تم آؤ گی تو شادی ہو گی ایسے کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہوں..." نبیلہ جانے کس سوچ میں تھیں، اپنے آپ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

"او کے ممی.....!" نبیل نے متوجہ کیا تو وہ چونک کر بولیں۔

"اچھا بیٹا! میں تمہاری پھوپھو کو فون کروں گی، مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی بہت اچھی لگی۔"

"تھینک یو....." نبیل مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر باہر آئے تو وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

پھوپھو، ان کی عظمتوں کو میں ہمیشہ سلام کرتا رہوں گا، جنہوں نے تم دونوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں جگہ دی۔ بلکہ تم دونوں سے بھی پہلے جب میرے ماں باپ ساتھ تھے اس وقت بھی میں زیادہ پھوپھو ہی کے پاس ہوتا تھا۔ اگر کبھی وقت نے میری آزمائش کی کہ مجھے ماں، باپ اور پھوپھو میں سے انتخاب کرنا پڑا تو میں پھوپھو کا انتخاب کروں گا۔

بہرحال ایسا وقت خدا کرے کبھی نہ آئے کہ مجھے انتخاب کرنا پڑے۔ زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہے یہی ٹھیک ہے۔ میں ہمیشہ پھوپھو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ایک سعادت مند بیٹے کی طرح، لیکن اس گھر میں نہیں۔ وہ ابا جی کا گھر ہے اور میری ماں جیسی پھوپھو نے ہماری خاطر اپنی زندگی اپنے ابا جی کے گھر گزار دی لیکن ابھی بہت زندگی باقی ہے۔ ان کا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ انہیں اپنا گھر دے سکے۔ ہے ناں؟" انہوں نے اسے گم سم حالت سے نکالنے کی خاطر تائید چاہی تو گہری سانس کے ساتھ اس نے سر ہلا دیا۔

"جانتی ہو آج پھوپھو نے مجھ سے کیا کہا؟" وہ آہستہ آہستہ سے اس کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکرا کر بولے۔ "کہ وہ اپنی سر پھری بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔"

"میرے خدا.....!" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اور میں ان کی بات تو نہیں ٹال سکتا۔" انہوں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

"کیوں، کیوں نہیں ٹال سکتے؟" وہ ایک دم چیخ گئی۔

"مجبوری ہے۔"

"کوئی مجبوری نہیں، آپ چاہیں تو صاف منع کر دیں۔" وہ ساری جھجکیں بھول کر ان کا بازو جھنجھوڑ کر بولی تھی۔

"اور اگر میں نہ چاہوں تو؟" وہ ایک جھٹکے سے گاڑی روک کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے تو وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔

"آ..... آپ..... بہت....."

نبیل نے آہستہ سے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"برا نہیں ہوں میں۔"

"اچھے بھی نہیں ہیں۔" وہ کہہ کر رخ موڑ گئی۔

تو نبیل نے شائد زندگی میں پہلی بار قہقہہ لگایا تھا۔

✿ ✿ ✿

شاہ سکندر ڈسچارج ہو کر آ گئے تھے اور اگلے ماہ نبیل بائی پاس کے لئے امریکہ جانا تھا، اس لئے اس سے پہلے ہی مدیحہ اور صباحت کی شادی طے کرنے کے لئے شاہ سکندر اور شاہ جہانگیر بابا جان کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے جنہیں دیکھ کر ابا جی بے اختیار بولے تھے۔

"بہت دیر کر دی۔"

"ہاں! رات ڈھل گئی۔" بابا جان نے ابا جی کو گئے وقت سے نکال کر آنے والے روشن دنوں کی نوید دے کر بٹھایا پھر کہنے لگے۔

"ہم کبھی گئے وقت کا ملال نہیں کرتے۔ ہماری نظریں ہمیشہ آنے والے وقت پر رہتی ہیں۔"

"اچھی بات ہے جو دسترس سے نکل گیا اس کا ملال کیسا؟" ابا جی کی تائید دکھ بھری تھی۔

آسیہ نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر ابا جی کو دیکھا تھا پھر بابا جان کی طرف متوجہ ہو گئی وہ پوچھ رہے تھے۔

"پھر آپ نے کیا طے کیا۔ دونوں بچیوں کی شادی ایک ساتھ کریں گے؟"

"جی ہاں، میں یہی چاہتا ہوں، آگے آپ کی مرضی۔"

"ہماری کیا مرضی، ہم تو ایک عرض لے کر آئے ہیں۔" بابا جان نے کہا تو ابا جی فوراً بولے

"جی فرمائیے۔"

"دونوں بچیوں کی شادی ایک ساتھ ٹھیک ہے لیکن ہماری خواہش ہے کہ مدیحہ ہمارے گھر سے رخصت ہو۔ یعنی شاہ پور سے، ہم وہاں سے علی کی بارات لے کر آئیں گے اور صباحت رخصت ہو کر وہیں شاہ پور جائے گی پھر اگلے روز ولیمے کی تقریب کے ساتھ ہم مدیحہ کی رخصتی رکھیں گے۔" بابا جان اپنا پروگرام بتا کر سب کو دیکھنے لگے۔

فوراً کسی نے جواب نہیں دیا۔ یوں بھی گفتگو صرف بابا جان اور ابا جان کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس لئے سب ابا جی کو دیکھنے لگے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔

"ہوں اچھی بات ہے، ایک بیٹی ماں کے گھر سے رخصت ہو گی تو ایک باپ کے گھر سے۔"

"واہ کیا پروگرام طے کیا ہے۔" میمونہ بھابھی نے آسیہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں کہا پھر اٹھ کر مٹھائی لینے چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد میمونہ بھابھی واپس آئیں تو مٹھائی کے ساتھ مبارک سلامت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ پھر بابا جان نے اسی وقت مدیحہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو آسیہ کے اشارے پر میمونہ بھابھی اسے تیار کرنے کے لئے اوپر آ گئیں۔

"صبا بیٹا! جلدی سے ایک بیگ میں مدحو کے کچھ کپڑے رکھ دو۔" میمونہ بھابھی نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا تو وہ حیران ہو کر بولیں۔

"کیوں مامی! مدحو کہاں جا رہی ہے؟"

"شاہ پور اپنے بابا جان کے ساتھ۔"

"کیوں مامی! میں نہیں جا رہی۔" اس نے احتجاج کیا تو میمونہ بھابھی آگے جا کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

"بیٹا! کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم تمہیں رخصت کرا کے یہیں لے آئیں گے۔"

"یعنی" صباحت سمجھ کر خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔

"کیا کہہ رہی ہیں مامی؟" مدیحہ کچھ سمجھی، کچھ نہیں۔

"صبا بتائے گی تمہیں، صبا بیٹا! جلدی کرو وہ لوگ جانے کو تیار ہیں۔" میمونہ بھابھی اس کا گال تھپک کر صباحت سے کہتی ہوئی چلی گئیں۔

"بے وقوف تمہاری شادی طے ہو گئی ہے نبیل بھائی کے ساتھ۔" عمر جانے کب سے دروازے میں کھڑا تھا۔ مدحو کی ہونق شکل دیکھ کر چلایا۔ پھر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"ہائے بے چارے نبیل بھائی، ان کی ساری زندگی تمہیں ذرا ذرا سی بات کا مطلب سمجھاتے گزر جائے گی۔"

"خبردار جو آگے ایک لفظ کہا، تو ورنہ میں ابھی نبیل بھا"

"ارے ارے.....!" عمر نے فوراً ٹوکا "بھائی مت کہہ دینا ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

"کہوں گی ایک بار نہیں سو بار کہوں گی۔" "نبیل.....!" بے ساختہ بولتے ہوئے اس کی زبان تالو سے چپک گئی۔

"ہاں ہاں، بولو آگے بولو۔" عمر اکسانے لگا۔

"تمہارا سر۔" اس نے تکیہ اٹھا کر عمر کے سر پر دے مارا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا، تب ہی ثوبیہ بھاگتی ہوئی آ گئی۔

"چلو بھئی مدحو صبا نیچے سب بلا رہے ہیں۔"

"مجھے بھی....." صباحت نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں تمہارا پردہ ہے سب سے؟" عمر نے کہا تو وہ اسے دھکیل کر سب سے آگے چل پڑی لیکن ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی، وہیں رک کر انتظار کیا، مدحیہ اور عمر کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

"آؤ بیٹا!" آسیہ اور شاہ سکندر بیٹیوں کو دیکھ کر ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی نے ہاتھ ان کی طرف بڑھائے تھے۔ بالکل بے اختیاری حرکات تھیں، جس نے سب کو اپنی اپنی جگہ جیسے ساکت کر دیا تھا۔

مدحیہ اور صباحت نے بہت خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئیں صباحت آسیہ اور مدحیہ شاہ سکندر کے پہلو میں رکی تو ساکت وجود یکدم متحرک ہو گئے تھے۔

"چلو بیٹا۔"

"اجازت دیجئے۔"

"انشاء اللہ جلد ملیں گے۔" مختلف آوازیں گونج رہی تھیں، ساتھ گلے مل رہے تھے اور ان گلے ملتے لوگوں کے درمیان وہ ندی کے دو کنارے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے اندر اب گئے وقتوں کا ملال نہیں تھا، بلکہ آنے والے دنوں کا حسین تصور جہاں ان کی اولاد کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ جن کی دھمک انہیں ابھی سے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی۔

اور وہ دل، جس میں محبت گھر کرے، وہ پھولوں کی بستی اجاڑنے والے اسے خواہ کتنا ہی اجاڑ لیں وہ سدا مہکتی رہتی ہے۔

"کیونکہ

"محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔"

❁ ❁ ❁